بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبدالحمید
خان سواتیؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان
صفدرؒ

ماہنامہ
الشریعہ
گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس و مدیر
حضرت مولانا ابوعمار
زاہد الراشدی

مدیر منتظم
ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۶۔ شمارہ ۳۔ مارچ ۲۰۲۵ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل ۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبدالغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔ ہلال خان ناصر۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبدالمتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

مسئلہ رؤیتِ ہلال کے چند توجہ طلب پہلو 5

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

رویتِ ہلال میں اختلاف پر شرمندگی کا حل 19

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

مسئلہ رؤیتِ ہلال، فقہ حنفی کی روشنی میں 25

مولانا مفتی محمد ایوب سعدی

مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پر اعتراضات کا جواب 42

اویس حفیظ

نظام ہائے کیلنڈر: ایک جائزہ 48

ترجمان

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کے افادات کی روشنی میں (۱۲۲) 54

ڈاکٹر محی الدین غازی

باجماعت نماز، قرآن وسنت کی روشنی میں 63

مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی

حضرت علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (۱) 71

مولانا طلحہ نعمت ندوی

فحاشی وعریانی اور لباس ونظر کا نفسیاتی مطالعہ! 86

محمد عرفان ندیم

مسجد اقصیٰ کے ایک مسافر کی تڑپ 92
عقیل دانش

ڈونلڈ ٹرمپ دوبارہ وہائٹ ہاؤس میں: مشرق وسطیٰ اور دنیا پر اس کے متوقع اثرات؟ 94
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

فلسطین کی جنگ بندی اور پیکا ایکٹ کی منظوری 101
مولانا فضل الرحمٰن / رپورٹ: مولانا حافظ نصر الدین خان عمر

قائد جمعیۃ مولانا فضل الرحمٰن کی گوجرانوالا آمد 103
مولانا حافظ خرم شہزاد

پاکستان شریعت کونسل کی تشکیلِ نو 106
پروفیسر حافظ منیر احمد / قاری محمد عثمان رمضان

108. Pakistan and Turkiye: The Center of Hope for the Muslim Ummah
Abu Ammar Zahid-ur-Rashdi

ہماری عبادات کے نظام کا ایک بڑا حصہ چاند کی گردش کے ساتھ متعلق ہے اور چاند کا مہینہ چاند کی رؤیت پر طے پاتا ہے۔ اگر انتیس دن کے بعد چاند نظر آجائے تو اگلا مہینہ شروع ہو جاتا ہے ورنہ گزشتہ ماہ کے تیس دن پورے کیے جاتے ہیں۔ پہلی رات کا چانداس قدر باریک ہوتا ہے کہ اسے دیکھنے کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے فقہاء اسلام نے ضابطے طے کیے ہیں جن میں فقہی اختلاف فطری امر ہے اور اس کے باعث رمضان المبارک اور عیدین کے تعیّن میں بسا اوقات فرق پڑتا ہے جو بحث و مباحثہ کا مستقل موضوع بن جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران اپنے مختلف مضامین میں راقم الحروف نے اس کے بہت سے فقہی اور معاشرتی پہلوؤں پر لکھا ہے جن کا انتخاب فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر نے زیر نظر مضمون کی صورت میں مرتب کیا ہے جو امید ہے کہ اس مسئلہ کو سمجھنے میں مفید ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قانونی وفقہی تجزیہ کی ضرورت

رؤیتِ ہلال کا مسئلہ ہمارے ہاں طویل عرصہ سے بحث و مباحثہ اور اختلاف و تنازعہ کا موضوع چلا آرہا ہے اور مختلف کوششوں کے باوجود ابھی تک کوئی تسلی بخش اجتماعی صورت بن نہیں پا رہی۔ اکابر علماء کرام کی مساعی سے حکومتی سطح پر مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی قائم ہوئی تو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ مسئلہ مستقل طور پر طے پا جائے گا، مگر ملک کے بیشتر حصوں میں اجتماعیت کا ماحول قائم ہو جانے کے باوجود بعض علاقوں میں انفرادیت کی صورتیں ابھی تک موجود ہیں۔ اور میڈیا کی وسعت، پالیسی اور مزاج کے باعث قومی اجتماعیت کی وہ صورت نہیں بن رہی جس کی مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے وجود میں آنے کے بعد توقع ہو گئی تھی۔

اس کے اسباب کسی حد تک فقہی اور شرعی ہونے کے ساتھ بڑی حد تک سیاسی اور معاشرتی بھی ہیں کہ حکومت اور دینی حلقوں کے درمیان شرعی معاملات میں اعتماد کی وہ فضا وجود میں نہیں آسکی جو اس قسم کے معاملات میں حکومتی احکام

کی عملداری قائم کرنے کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ایک اسلامی یا کم از کم مسلم ریاست میں بہت سے معاملات میں حکومت ہی اتھارٹی ہوتی ہے جس کی فقہاء کرام نے مختلف معاملات میں صراحت کی ہے، لیکن اس اتھارٹی کے عملی اظہار کے لیے باہمی اعتماد کی فضا ناگزیر ہوتی ہے۔

بیرونی استعمار کے تسلط سے قبل مسلم ریاستوں میں سیاسی اور گروہی اختلافات و تنازعات کے باوجود یہ اعتماد پایا جاتا تھا کہ حکومت خود جیسی بھی ہو، شرعی معاملات میں گڑبڑ نہیں کرے گی اور علماء کرام کے مشورہ سے ہی شرعی مسائل کو طے کرے گی، حتیٰ کہ اکبر بادشاہ کے ''دینِ الٰہی'' کے عروج کے دور میں بھی عام لوگوں کے شرعی معاملات ان کے قاضیوں کے ذریعے ہی طے کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ اعتماد بیرونی استعمار کے تسلط کے زمانے میں قائم نہیں رہا، جس کا تسلسل آزادی کے بعد کے دور میں بھی جاری ہے، اور اسی وجہ سے اس قسم کی بہت سی معاشرتی الجھنیں موجود ہیں جن میں سے ایک رؤیتِ ہلال کا مسئلہ بھی ہے۔

اکابر علماء کرام کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ایسے معاملات میں اجتماعیت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور تفرقہ و انتشار سے قوم کو ہر ممکن حد تک بچایا جائے، چنانچہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا قیام اکابر علماء کرام کی توجہ اور مساعی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا اور کسی حد تک مرکزیت و اجتماعیت کی صورت سامنے آگئی تھی۔ خود میرا مشاہدہ ہے کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے باضابطہ قیام سے پہلے گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد کو علاقہ میں وہی پوزیشن حاصل تھی جو پشاور کی مسجد قاسم علی خان کو اس سلسلہ میں حاصل چلی آرہی ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبد الواحد رحمہ اللہ تعالیٰ کا شمار ملکی سطح پر اکابر علماء کرام میں ہوتا تھا اور وہ میرے والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے استاذ محترم تھے۔ انہیں پورے علاقہ میں مرکزیت و مرجعیت حاصل تھی۔ چاند دیکھنے کے لیے مرکزی جامع مسجد میں اس رات شہر کے بڑے بڑے علماء کرام جمع ہوتے تھے، رات گئے تک شہادتوں کا انتظار رہتا تھا، اور بسا اوقات سحری کے وقت فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ اردگرد کے علماء کرام جامع مسجد کے فیصلے کے انتظار میں ہوتے تھے۔ والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بار بار پوچھتے تھے کہ جامع مسجد گوجرانوالہ میں کیا اعلان ہوا ہے؟ لیکن جب مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی بن گئی اور اس نے کام شروع کر دیا تو جامع مسجد کی چاند رات کی رونقیں آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر خود میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے پوچھا کہ رؤیتِ ہلال کا فیصلہ کرنے کے لیے علماء کرام کو بلانا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا، کوئی ضرورت نہیں ہے، جو فیصلہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کرے گی، ہم اس پر عمل کریں گے۔

مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اگرچہ اس سلسلہ میں مجاز اتھارٹی ہے، مگر اس کے فیصلوں اور طرز عمل سے علمی بنیاد پر اختلاف کی گنجائش ہر دور میں موجود رہی ہے، جس کا اظہار مرکز گریز حلقوں کی طرف سے مسلسل ہوتا آرہا ہے اور بحث و مکالمہ کے مختلف پہلو اس حوالے سے سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس پس منظر میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی صاحبِ علم اس مسئلہ کے تمام متعلقہ پہلوؤں کا فقہی اور علمی بنیاد پر جائزہ لے کر اس کے مجموعی تناظر کو سامنے لائیں تاکہ اس سلسلہ میں کوئی رائے آسانی کے ساتھ قائم کی جا سکے۔ بہت سے اصحابِ علم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ان کی کاوشیں مسئلہ کو سمجھنے میں یقیناً مددگار ہیں، لیکن بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ قانون کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے زیادہ وسیع تناظر میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے اور اس کی فقہی و فنی ضروریات کا احاطہ کرنے کے ساتھ معاشرتی ماحول اور قانونی صورتحال کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وہ ایک مسلّمہ علمی خاندان کے فرد ہیں، دینی اور عصری علوم پر یکساں نظر رکھتے ہیں، قانونی پیچیدگیوں اور موشگافیوں سے بخوبی آگاہ ہیں، اور معاشرتی ماحول کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہیں۔ چنانچہ ان کی اس علمی کاوش (رویتِ ہلال: قانونی وفقہی تجزیہ) میں ان کی یہ تمام خصوصیات جھلک رہی ہیں۔ انہوں نے جس عرق ریزی کے ساتھ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے اور اس کے حل کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ معروضی حالات میں بہت مناسب بلکہ ضروری ہیں۔ اور ہم صرف ایک گذارش کے ساتھ ان کی تمام تجاویز کی تائید کرتے ہیں کہ مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے ریاستی اداروں، عوام اور دینی حلقوں کے درمیان باہمی اعتماد کی ایسی فضا کا قائم کرنا بھی ضروری ہے جو شرعی معاملات میں حکومتی اقدامات کی عملداری کو یقینی بنا سکے۔

شرعی عبادات و معاملات میں ایام و اوقات کا تعیّن

دنیا میں سورج اور چاند کی گردش کے حساب سے دو قسم کے سن رائج ہیں:

1. سورج کی گردش کے لحاظ سے جو سن رائج ہے وہ شمسی کہلاتا ہے اور جنوری، فروری، مارچ وغیرہ اسی کے مہینے ہیں۔ مروّجہ شمسی سن عیسوی اور میلادی سن بھی کہلاتا ہے جس کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ہوتا ہے۔ اور ۲۰۲۵ء کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کو اتنے سال گزر چکے ہیں اور ان کی عمر اب دو ہزار پچیس سال کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔
2. چاند کی گردش کے حساب سے جو سن مروّج ہے وہ قمری کہلاتا ہے اور محرم، صفر، ربیع الاول وغیرہ اس کے مہینے ہیں۔ ہجری سن قمری حساب سے ہے جس کا آغاز جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ہوتا ہے، یعنی آنحضرتؐ نے مکہ مکرمہ سے جس سال مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تھی وہاں سے ہجری سن شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۴۴۶ھ کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت کو چودہ سو چھیالیس سال ہو چکے ہیں۔ ہجری نبویؐ سے اسلامی سن کے آغاز کا حکم سب سے پہلے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے دیا تھا اور اس کے بعد سے ہماری اسلامی تاریخ اسی حساب سے چلی آ رہی ہے۔

چنانچہ اوقات اور ایام کے تعیّن کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا حساب چلتا ہے۔ البتہ سورج کی گردش والا سال چاند کی گردش والے سال سے چند دن بڑا ہوتا ہے اور گرمی سردی کے موسم بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں، اس لیے چاند کی گردش والا سال موسم کے حساب سے بدلتا رہتا ہے۔ ہماری عبادات اور شرعی معاملات میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار ہے۔ شریعت میں دِنوں کا تعیّن چاند سے اور اوقات کا تعیّن سورج سے ہوتا ہے۔

ہم جب مہینے اور ایام طے کرتے ہیں تو ان میں چاند کا اعتبار ہوتا ہے مثلاً رمضان کا مہینہ، محرم کا مہینہ۔ اسی طرح شب برأت، شبِ معراج، شبِ قدر، ایامِ عشورہ، ایامِ بیض، ایامِ حج وغیرہ۔ روزہ کے دن کا تعیّن چاند سے کرتے ہیں کہ یہ پہلا روزہ ہے، یہ آخری روزہ ہے۔ جبکہ اوقات کا تعلق سورج سے ہے کہ طلوعِ فجر سورج کے طلوع سے پہلے ہوگی اور مغرب سورج کے غروب ہونے کے بعد، اس طرح روزہ کے آغاز واختتام کا وقت اور اس کے دورانیہ کا تعیّن بھی سورج کی گردش سے ہے۔

حج کے ایام چاند کے اعتبار سے طے ہوتے ہیں کہ آج یوم الترویہ ہے، آج یوم الحج ہے، آج یوم الاضحیٰ ہے۔ لیکن حج کے اوقات اور اعمال کا تعیّن سورج سے ہے کہ رمی کس وقت کرنی ہے، مزدلفہ کب جانا ہے، عرفات سے کب آنا ہے۔

ہم نمازوں کے اوقات بھی سورج کی گردش سے طے کرتے ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء سب نمازوں کے اوقات کا تعلق سورج کی گردش سے ہے۔ سورج کا دورانیہ بڑھ جائے گا تو نمازوں میں وقفہ زیادہ ہوجائے گا اور سورج کا دورانیہ کم ہوگا تو نمازوں میں وقفہ کم ہوجائے گا۔

چنانچہ ایسا نہیں ہے کہ ہم سورج کی گردش کو نہیں مانتے بلکہ ہم تو روزمرہ اسی کو مانتے ہیں کہ ہمارے اعمال اور اوقات سورج کی گردش کے حساب سے چلتے ہیں، اور ایام اور مہینے چاند کی گردش کے اعتبار سے چلتے ہیں۔ البتہ چاند کا مہینہ سورج کے مہینے سے چھوٹا ہے، تقریباً دس دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ مفسرین اس میں بہت سی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔ ایک حکمت یہ کہ چاند کا مہینہ ہر تین سال کے بعد سورج کا مہینہ بدل لیتا ہے اور سورج کے تینتیس سالوں میں چاند کا مہینہ چاروں موسموں میں گردش پوری کر لیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کو بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر کو پہنچنے تک تیس پینتیس سال مل جائیں تو وہ سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے، ٹھنڈے روزے، گرم روزے، لمبے روزے، درمیانے روزے، چھوٹے روزے، گویا اس نے پورا سال روزے رکھے ہیں۔

ضمناً یہ عرض کر دیتا ہوں کہ فقہاء یہ مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حساب چاند کے مہینوں کے مطابق کرنا شرعاً ضروری ہے ورنہ سورج کے تینتیس سال میں ایک سال کی زکوٰۃ رہ جائے گی کیونکہ یہ چاند کے چونتیس سال ہوں گے۔ الغرض شرعی احکام و معاملات میں سورج اور چاند دونوں کی گردش کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ ماہ و ایام کی تعیین چاند کے ساتھ جبکہ اوقات کی تعیین سورج کے ساتھ ہے۔

رؤیتِ ہلال اور اختلافِ مطالع

رؤیتِ ہلال کے سلسلہ میں چند اصولی باتوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے قارئین کو موجودہ صورتحال کا پس منظر سمجھنے میں کچھ آسانی ہوگی۔

پہلی بات یہ ہے کہ رمضان اور عید کا چاند آنکھوں سے دیکھنے پر کیوں زور دیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں سائنسی آلات اور حساب کا اعتبار کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''صوموا لرؤیتہ و افطروا لرؤیتہ'' (رواہ مسلم) کہ چاند دیکھ کر رمضان شروع کرو اور چاند دیکھ کر عید الفطر مناؤ۔ ورنہ سائنسی آلات اور سائنسی حساب سے علماء کرام کو کوئی ضد نہیں ہے اور وہ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات، نمازوں کے اوقات کے تعیّن، اور دیگر معاملات میں سائنسی حساب کتاب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ البتہ چاند کے مہینہ کے آغاز کے لیے ''رؤیت'' کو ضروری سمجھتے ہیں جس میں ان کی اپنی رائے کا کوئی دخل نہیں بلکہ جناب رسول اللہؐ کے ارشاد کی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے رؤیت کا حکم دیا ہے وہاں رؤیت ضروری ہے اور جہاں اس کا حکم نہیں دیا وہاں معروف اور مروّجہ حساب کتاب کا لحاظ رکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔

آخر سورج کے غروب اور طلوع کے ساتھ بھی تو شرعی احکام اور عبادات کا تعلق ہے، کیا علماء کرام کے کسی طبقے نے کبھی اس بات پر زور دیا ہے کہ ہم سورج کو اپنی آنکھوں سے ڈوبتا دیکھ کر روزہ کے افطار اور نمازِ مغرب کے وقت کے آغاز کا فتویٰ دیں گے؟ وہاں وہ ماہرینِ فلکیات کے مرتب کردہ نقشوں اور مروجہ گھڑیوں پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ اسی طرح انہیں چاند کے بارے میں ماہرینِ فلکیات کے نقشوں کو فیصلے کا مدار قرار دینے میں بھی کوئی انکار نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ اس کے بارے میں آنحضرتؐ کا حکم باقی معاملات سے مختلف اور جداگانہ ہے کہ آپؐ نے چاند دیکھ کر رمضان المبارک کے آغاز اور چاند دیکھ کر ہی عید کرنے کا حکم دے رکھا ہے، اس لیے علماء کرام رمضان اور عید کے لیے چاند کو آنکھوں سے دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا عالمِ اسلام میں ایک روز عید ممکن ہے؟ اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پورے عالمِ اسلام کا مطلع ایک نہیں ہے۔ مثلاً پاکستان اور سعودی عرب کے وقت میں دو گھنٹے کا فرق ہے اور سعودی عرب میں سورج پاکستان سے دو گھنٹے بعد غروب ہوتا ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ چاند ایسے وقت میں طلوع ہو کہ پاکستان میں نظر نہ آئے اور سعودی عرب میں نظر آجائے، لہٰذا پاکستان اور سعودی عرب میں ایک دن یا بسا اوقات دو دن کا فرق بھی ہو سکتا ہے اور یہ بات سائنسی حساب کتاب میں تسلیم شدہ ہے۔ اسی طرح پورے عالمِ اسلام میں اوقات کے فرق کو دیکھ کر اندازہ کر لیجیے کہ انڈونیشیا سے مراکش تک اوقات کے فرق کی ترتیب کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات تو طے شدہ ہے کہ تمام مسلم ممالک کا مطلع ایک نہیں ہے اور ایک دن یا کبھی کبھار دو دن کا فرق پڑ جانا معمول کی بات ہے۔

چنانچہ جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ چاند کے طلوع ہونے میں سائنسی طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں وقت کا فرق موجود ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علاقے میں ایک روز چاند نظر آتا ہے اور اس سے دور دوسرے علاقے میں دوسرے روز پہلی رات کا چاند دکھائی دیتا ہے، تو یہ بات بطور ایک واقعہ کے درست ہے۔ چاند کی گردش کے حوالے سے ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے، لیکن کیا شرعاً اس کا اعتبار ضروری ہے؟ اور کیا ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آجائے تو باقی دنیا کے لوگ اسی کا اعتبار کرتے ہوئے ایک ہی دن روزہ اور عید کا اہتمام کرلیں؟

سوال یہ ہے کہ مطلع کے اس اختلاف کا شرعاً اعتبار ہے یا نہیں؟ اسے فقہی اصطلاح میں اختلافِ مَطالع کا اعتبار کرنے یا نہ کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں فقہائے امت کے دو گروہ ہیں۔ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ''فتاویٰ محمودیہ'' میں اور حضرت مولانا زوار حسین شاہ آف کراچی نے ''عمدۃ الفقہ'' میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق:

۱. حنفی، حنبلی اور مالکی مذاہب کے ائمہ اختلافِ مَطالع کا اعتبار نہیں کرتے اور ان کا یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کا ثبوت ہوجائے تو باقی دنیا کے لیے اس کی پابندی ضروری ہوجاتی ہے۔
۲. البتہ شافعی فقہ کے ائمہ اور احناف میں سے امام زیلعیؒ اور سید انور شاہ کشمیریؒ اختلافِ مَطالع کا اعتبار کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جہاں چاند دیکھنے میں ایک دن کا فرق پڑجائے وہاں مَطالع کا اختلاف معتبر ہے اور ایک جگہ چاند نظر آنے سے دوسری جگہ کے لوگوں پر روزہ اور عید لازم نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں اگرچہ عمل اب تک دوسرے قول پر ہورہا ہے لیکن اہلِ سنت کے تینوں مکاتبِ فکر یعنی بریلوی، دیوبندی اور اہلِ حدیث کے اکابر علماء کرام نے صراحت کی ہے کہ ان کے نزدیک مَطالع کا اختلاف شرعاً معتبر نہیں ہے اور دنیا میں کسی ایک جگہ بھی چاند کا شرعی ثبوت مل جانے کی صورت میں باقی ساری دنیا کے مسلمان اس کے پابند ہو جاتے ہیں، چنانچہ:

۱. بریلوی فکر کے ممتاز مفتی حضرت مولانا امجد علی اعظمیؒ ''بہارِ شریعت'' میں لکھتے ہیں کہ ایک جگہ چاند ہو تو وہ صرف وہیں کے لیے نہیں بلکہ تمام جہان کے لیے ہے، مگر دوسری جگہ اس کا حکم اس وقت ہے کہ ان کے نزدیک اس کی تاریخ میں چاند ہونا شرعاً ثابت ہوجائے۔
۲. دیوبندی مکتبِ فکر کے ایک بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ نے ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' میں صراحت کی ہے کہ مَطالع کا اختلاف عملاً موجود ہے لیکن احناف کے نزدیک شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے، اور اگر مغرب میں چاند نظر آجانے کا ثبوت شرعی ہوجائے تو اہلِ مشرق اس کے مطابق روزہ رکھنے اور عید کرنے کے پابند ہیں۔

۳۔ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے ہاں قاضی شوکانیؒ کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور ’’فتاویٰ محمودیہ‘‘ میں مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے قاضی شوکانیؒ کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ مَطالع کے اختلاف کا شرعاً اعتبار نہیں ہے۔

فقہائے احناف کا معتبر قول یہ ہے کہ رؤیتِ ہلال میں اختلافِ مَطالع کا اعتبار نہیں ہے، چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند حصہ سوم صفحہ ۴۹ میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ

’’صحیح و مختار مذہب کے موافق اختلافِ مَطالع ہلالِ صوم و فطر میں معتبر نہیں، اہلِ مغرب کی رؤیت سے اہلِ مشرق پر حکم ثابت ہو جاتا ہے‘‘۔

اس کے ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب نے ’’درِّ مختار‘‘ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حنابلہ اور مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ اگر اس قول کو اختیار کر لیا جائے تو کوئی الجھن باقی نہیں رہ جاتی اور عالمِ اسلام میں کسی جگہ بھی چاند نظر آ جائے تو پورے عالمِ اسلام میں رمضان المبارک اور شوال المکرم کا آغاز کیا جا سکتا ہے اور عید ایک روز منائی جا سکتی ہے۔

مولانا مفتی منیر احمد اخون ہمارے فاضل دوست ہیں اور نیویارک میں ایک علمی مرکز قائم کر کے فتویٰ اور اصلاح و ارشاد کے میدان میں مسلمانوں کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس پر کتاب لکھی ہے کہ مکہ مکرمہ کی رؤیت پر اعتماد کر کے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اس کے مطابق ایک ہی دن روزہ کا آغاز کرنا چاہیے اور ایک ہی دن عید منانی چاہیے۔ اور برصغیر پاک و ہند کے دو بڑے مذہبی مکاتبِ فکر دیوبندی اور بریلوی کے اکابر علماء کرام کے فتاویٰ کو اس تجویز کی بنیاد بنایا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا یہ ارشاد انہوں نے ’’الکوکب الدری‘‘ سے نقل کیا ہے کہ

’’اگر کلکتہ (ہندوستان) میں چاند جمعہ کی رات میں نظر آیا اور مکہ میں خمیس (جمعرات) کی رات کو، اور کلکتہ والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ مکہ میں رمضان خمیس (جمعرات) سے شروع ہو چکا ہے، تو جب ان کو اس بات کا پتہ چلے گا تو ان کے لیے ضروری ہوگا کہ عید مکہ والوں کے ساتھ منائیں اور پہلا روزہ قضا کریں‘‘۔

حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا فتویٰ ’’فتاویٰ رضویہ‘‘ سے انہوں نے اس طرح نقل کیا ہے کہ

’’عمرو کا قول، کہ ہندوستان سے دور دراز ملک مکہ معظمہ میں ۲۹ کا چاند ہو گیا ہے تو پھر بہرائچ والوں کو ان کے ساتھ روزہ نہ رکھنے کی بنا پر ایک روزے کی قضا کرنا لازم ہے، صحیح ہے۔ ہمارے ائمہ کرام کا مذہب صحیح معتمد یہی ہے‘‘۔

جبکہ ’’فتاویٰ رحیمیہ‘‘ کے حوالہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ

”اگر مکہ یا مدینہ میں شرعی ثبوت کے ساتھ خبر آجائے کہ وہاں یہاں سے پہلے چاند ہوا ہے تو ہندوستان والوں پر اس خبر کی وجہ سے ایک روزہ رکھنا فرض ہوگا“۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہور فقہائے احناف کے ساتھ ساتھ حنبلی اور مالکی فقہ کے ائمہ کرام کے درمیان اس مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں۔ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے قاضی شوکانیؒ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں پہلی رات کا چاند نظر آنے کے اوقات میں فرق موجود ہونے کے باوجود مَطالع کے اس اختلاف کا شرعاً اعتبار کرنا ضروری نہیں ہے، اور دنیا کے کسی بھی حصے میں چاند نظر آنے کی صورت میں باقی دنیا کے مسلمان بھی اسی روز عید اور روزہ کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان بزرگوں کی بات مان کر نہ صرف ملک بھر میں ایک ہی روزے اور عید کا اہتمام ممکن ہے بلکہ عرب ممالک کے ساتھ عید اور روزہ میں ہم آہنگی بھی ہو سکتی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ جب جمہور فقہائے احناف، مالکیہ، حنابلہ کے نزدیک اختلافِ مَطالع کا اعتبار نہیں ہے اور کسی ایک جگہ چاند کا ثبوت ہو جائے تو باقی دنیا کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، تو پھر اس سلسلہ میں لمبے بکھیڑے میں پڑنے اور عام مسلمانوں کو خواہ مخواہ پریشانی میں ڈالنے کی بجائے وحدتِ امت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا زیادہ بہتر ہے، اور اکابر علماء کرام کو اس سلسلہ میں باہمی مشاورت کے ساتھ کوئی اجتماعی اجتہادی فیصلہ کرنا چاہیے۔

ایک موقع پر سرحد اسمبلی نے ایک متفقہ قرارداد منظور کی کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کو توڑ دیا جائے اور رمضان المبارک اور عیدین وغیرہ کے نظام کو سعودی عرب کے ساتھ منسلک کر کے جس روز سعودیہ میں چاند کا اعلان ہو اُس کے مطابق روزہ اور عید کا پاکستان میں بھی اعلان کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک سرحد اسمبلی کی یہ قرارداد ملک بھر کے دینی حلقوں اور اربابِ حل و عقد کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔ پاکستان کے عوام کی ایک مدت سے خواہش ہے کہ وہ سب ایک ہی دن عید منائیں اور اکٹھے روزہ رکھیں، ان کی یہ خواہش ناجائز نہیں ہے، اسے پورا کرنے میں شرعاً بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اور فقہائے امت کی بڑی تعداد ان کے اس حق کی حمایت کر رہی ہے، تو پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے، ان کے مل بیٹھ کر نیا اجتہادی فیصلہ کرنے سے عوام کو یہ خوشی مل سکتی ہے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

مغربی ممالک کی صورتحال، فلکیاتی حسابات، سعودی عرب کا اعلان

مسلمانوں میں وحدت کا اہتمام اور متفقہ فیصلہ بہت زیادہ ضروری ہے۔ یہ صورتحال انتہائی تکلیف دہ ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں ایک ہی شہر میں کچھ لوگوں کا روزہ ہوتا ہے اور کچھ کا نہیں ہوتا اور عید کے موقع پر بھی کچھ مسلمان عید منا رہے ہوتے ہیں اور کچھ روزے سے ہوتے ہیں۔ بالخصوص امریکہ اور برطانیہ میں بعض ذمہ دار حضرات کے بقول حکومت مسلمانوں کو عیدین کے لیے سرکاری چھٹی کی سہولت دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس اختلاف کی وجہ سے ایسا نہیں ہو پا رہا۔ اجتہادی مسائل میں اختلافِ رائے اور مختلف اقوال کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ اجتماعی

حالات اور ضروریات کے تحت ان میں سے کوئی قول بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور علماء کرام باہمی مشاورت و اتفاق سے کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کے علماء کرام اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتے جو اس مسئلے کا افسوسناک پہلو ہے۔

مغربی ممالک میں اِن دنوں علمی و دینی مجالس میں چاند کا مسئلہ ہی زیر بحث رہتا ہے۔ مسلمانوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جو فلکیات کے حساب کی بنیاد پر پہلے سے رمضان المبارک اور عید الفطر کے دن کا اعلان کر دیتا ہے۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ چونکہ فلکیات کا حساب اس قدر سائنٹفک ہو چکا ہے کہ اس کے اندازوں میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا، اس لیے جس طرح ہم نمازوں کے اوقات کے تعیّن میں فلکیات کے حساب اور سائنسی اداروں کی تحقیقات پر اعتماد کر کے پورے سال کا نقشہ پہلے سے چھپوا لیتے ہیں کہ فلاں دن اس وقت سورج طلوع ہوگا، اس وقت زوال ہوگا، اس وقت سورج غروب ہوگا، اور اس وقت شفقِ احمر یا شفقِ ابیض غائب ہوگی، اور اس کے لیے ہم سورج کو دیکھنے اور اس کی چال پر نظر رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے، اسی طرح چاند کے معاملے میں بھی سائنسی اداروں کی تحقیقات پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور ان کے بنائے ہوئے نقشوں کے مطابق ہمیں پہلے سے روزے، عید اور قربانی وغیرہ کے ایام کا تعیّن کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ عملاً ایسا ہی کرتے ہیں۔

دوسری طرف علماء کرام کی ایک بڑی تعداد اور دینی تنظیموں کا موقف یہ ہے کہ چاند کے معاملے میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خاص رؤیت کا حکم دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔ اس لیے رمضان، عید الفطر اور حج وغیرہ کے ایام کے تعیّن کے لیے چاند کی رؤیت ضروری ہے اور صرف اسی بنیاد پر روزے اور عید کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ سورج کی رفتار کے ساتھ ہماری نمازوں کے اوقات کا تعیّن وابستہ ہے لیکن اس کے بارے میں رؤیت کے اہتمام کا اس طرح کا حکم نہیں ہے، اس لیے اس میں ہم سائنسی اداروں کی تحقیقات کو بنیاد بنا لیتے ہیں اور روزانہ سورج کی رفتار دیکھے بغیر پہلے سے نمازوں کے اوقات کا تعیّن کر لیتے ہیں، مگر چاند کے بارے میں رؤیت کا بطور خاص حکم ہے اس لیے اس معاملے میں رؤیت کو ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک موقع پر امریکہ میں ایک دوست نے سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم الشیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل الشیخ حفظہ اللہ تعالیٰ کا ہفت روزہ ایشیا ٹریبون میں شائع ہونے والا ایک بیان دکھایا جس میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ محکمہ موسمیات کی پیشگوئی کی بنیاد پر رمضان اور شوال سمیت دیگر اسلامی مہینوں کی تاریخ کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا، اور نیا چاند دیکھے بغیر قبل از وقت پیشگوئی غیر اسلامی ہے۔ اس دوست کا مقصد یہ تھا کہ جب سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم رؤیت کو شرعاً ضروری قرار دے رہے ہیں تو سعودی عرب کے رؤیت کے اعلان پر تحفظات کی بنیاد کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ تحفظات تو بہرحال بہت سے علماء کرام کو ہیں اور خود مجھ سے بعض ثقہ اور جید علماء کرام نے مختلف ممالک میں ان تحفظات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں سعودی حکومت سے بات ہونی چاہیے بلکہ خود سعودی عرب کو عالمِ اسلام کے علماء کرام کو اعتماد میں لے کر

رؤیتِ ہلال کا کوئی ایسا نظام طے کرنا چاہیے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، اور سعودی حکومت کو حرمین شریفین کے حوالے سے اسے دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

امتِ مسلمہ کے جمہور علماء کرام کا موقف یہی ہے اور امریکہ میں بھی دینی حلقوں کی اکثریت اسی پر عمل کرتی ہے، البتہ اصولی طور پر رؤیت کی بنیاد پر روزے اور عید وغیرہ کا فیصلہ ضروری سمجھنے کے باوجود اس کی تفصیل پر اختلاف ہے۔ ایک حلقہ یہ کہتا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی چاند دیکھے جانے کی خبر شرعی اصولوں کے مطابق مل جائے تو روزے اور عید کا اعلان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ عرب حلقے اور ان کے دینی مراکز چاند دیکھنے کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ سعودی عرب میں چاند کا اعلان ہو جانے پر روزے اور عید کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مگر بہت سے دینی حلقے بالخصوص پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی مراکز امریکہ میں الگ سے چاند دیکھنے کے اہتمام کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کی بنیاد پر روزے اور عید کے دن کا تعیّن کرتے ہیں۔

اس وجہ سے کم وبیش ہر سال یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دو عیدیں تو یقینی ہیں، کبھی کبھار بعض علاقوں میں تین عیدیں بھی ہو جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ واشنگٹن (ڈی سی) میں ایک پاکستانی فیملی سے تعلق رکھنے والے دوست مجھے بتا رہے تھے کہ بعض گھروں میں بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ میاں عید کر رہے ہیں اور بیوی روزے سے ہے، باپ کا روزہ ہے اور بیٹے عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں، بعض حضرات اپنے رشتہ داروں سے عید ملنے جاتے ہیں تو وہ آگے روزے سے ہوتے ہیں۔

چند سال قبل ہیوسٹن (ٹیکساس) کے جامعہ اسلامیہ کے مہتمم مولانا حافظ محمد اقبال نے، جو چشتیاں سے تعلق رکھتے ہیں اور علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فاضل ہیں، اس مسئلہ پر میرے ساتھ ایک مستقل نشست کی کہ ہمارے مرکز میں نمازیوں کی اکثریت عرب حضرات کی ہے جو سعودی عرب کے اعلان پر روزہ اور عید کرتے ہیں، جبکہ ہم امریکہ میں چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس لیے ہمارے ہاں ہر سال خلفشار کی صورت ہوتی ہے، عرب حضرات ہماری بات نہیں مانتے اور ہم ان کی بات کو قبول نہیں کرتے۔ حافظ محمد اقبال صاحب کا کہنا تھا کہ وہ عمل تو ان حضرات کے ساتھ کرتے ہیں جو امریکہ میں چاند کی رؤیت کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ان کے خیال میں اب یہ ہوتا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے اور مسلمان حلقوں اور خاندانوں کو اس خلفشار سے نجات دلانے کے لیے سعودی عرب کے اعلان پر آجانا چاہیے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں خاصا مواد جمع کر رکھا تھا کہ جب احناف متقدمین کے نزدیک اختلافِ مَطالع کا اعتبار نہیں ہے اور ہمارے بڑے اکابر کی صراحت موجود ہے کہ اہلِ مغرب کی رؤیت اہلِ مشرق کے لیے حجت ہے، تو پھر ہمیں مسلمانوں کی وحدت کے لیے اسی قدیمی موقف کی طرف واپس چلے جانا چاہیے۔

ایک سال بالٹیمور (میری لینڈ) میں مولانا محمد عرفان صاحب کے دار العلوم میں بھی اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں دوست مجھ سے پوچھتے کہ آپ کا فتویٰ کیا ہے؟ میں نے ہر جگہ یہ عرض کیا کہ میں مفتی نہیں ہوں اور نہ ہی فتویٰ دیا کرتا ہوں، البتہ ایسے مسائل پر یہ رائے ضرور رکھتا ہوں کہ جس معاملے میں فقہی اور شرعی طور پر ایک سے زیادہ آرا

کی گنجائش موجود ہو اور اجتہادی بنیاد پر فقہاء کے اقوال مختلف ہوں، وہاں مسلمانوں کی اجتماعیت اور عمومی مصلحت کو فیصلے کی بنیاد بنایا جانا چاہیے۔

مثال کے طور پر میں نے ایک مسئلہ کا حوالہ دیا کہ بٹائی یعنی حصے پر زمین کاشت کے لیے دوسروں کو دینے کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے، مگر صاحبین یعنی امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اس پر فقہاء احناف نے تفصیلی بحث کی ہے۔ ایک دور میں اس مسئلہ پر میں نے بھی کچھ کام کیا تھا اور ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور میں اس موضوع پر میرا ایک مقالہ کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس دوران فقہاء احناف کی بحث کا مطالعہ کرتے ہوئے حضرت ملا علی قاریؒ کا یہ قول میری نظر سے گزرا، جس کا میں نے اپنے مضمون میں حوالہ بھی دیا، کہ مزارعت کے مسئلہ پر دلائل تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں لیکن عمومی مصلحت چونکہ صاحبین کے قول پر عمل کرنے میں ہے اس لیے فتویٰ انہی کے قول پر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کے مسائل میں میرا طالب علمانہ رجحان یہی پختہ ہو گیا ہے کہ اجتہادی مسائل میں جہاں دونوں طرف گنجائش موجود ہو، فیصلہ کرتے وقت مسلمانوں کی اجتماعیت اور عمومی مصلحت کو ترجیح دینی چاہیے۔

ایک سال رمضان المبارک کا آغاز دارالحکومت واشنگٹن کے علاقے میں کیا اور دارالہدیٰ (ورجینیا) میں اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں تراویح پڑھی، لیکن واشنگٹن میں ہمارے ہی حلقے کی دوسری مساجد میں نہ تراویح ہوئی اور نہ ہی اگلے دن لوگوں کا روزہ۔ وہاں مولانا عبد الحمید اصغر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے تو میں نے عرض کیا کہ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ یہاں کے علماء کرام اور دینی حلقے باہمی مشاورت سے اجتماعی فیصلہ کریں، البتہ اس فیصلے میں وہ کسی طرف بھی جا سکتے ہیں۔ وہ اختلافِ مَطالع کا اعتبار کرتے ہوئے چاند کی علاقائی رؤیت کو بنیاد بنانے کا فیصلہ کریں تو یہ بھی شرعاً درست ہے۔ اور اختلاف مَطالع کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سعودی عرب یا کسی دوسری جگہ چاند نظر آنے کے اعلان پر روزہ اور عید کا فیصلہ کریں تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں۔ مگر اجتماعیت ضروری ہے اور مسلمانوں کو خلفشار سے نکالنا ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ سعودی عرب کے اعلان پر علماء کرام کے تحفظات ہیں کہ وہاں رؤیت پر فیصلہ ہوتا ہے یا کیلنڈر کی بنیاد پر اعلان کیا جاتا ہے، اس لیے ہم اس اعلان پر فیصلہ نہیں کرتے۔

پاکستان کی صورتحال اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی

جہاں تک مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا تعلق ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور تک صورتحال یہ تھی کہ اگرچہ سرکاری طور پر چاند نظر آنے یا نہ آنے کا اعلان کیا جاتا تھا لیکن چونکہ اس کا نظم صرف سرکاری ہوتا تھا اس لیے عام طور پر اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا اور ہر علاقے میں علماء کرام اپنے طور پر چاند دیکھنے کا اہتمام کر کے اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اس صورت میں اکثر ایسے ہو جاتا تھا کہ ایک شہر میں عید ہو رہی ہے مگر اس سے تھوڑے

فاصلے پر دوسرے شہر میں عید نہیں ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک مسلک کے لوگ روزے رکھے ہوئے ہیں مگر دوسرے مسلک کے لوگوں کی عید ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک شہر کے کچھ لوگ عید منا رہے ہیں اور اسی شہر کے باقی لوگوں کا روزہ ہے۔ بلکہ ایک بار گوجرانوالہ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ خود ہمارے دیوبندی مسلک کے بعض علماء کرام نے عید کی اور اسی مسلک کے دوسرے علماء عوام کو روزہ رکھوائے ہوئے تھے۔

پشاور کی مسجد قاسم علی خان کی طرح ہمارے ہاں گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد اس سلسلے میں سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی اور روزے یا عید کا چاند دیکھنے اور اس سلسلے میں شہادتیں لے کر فیصلہ کرنے کے لیے علماء کرام استاد العلماء حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے پاس جمع ہو جایا کرتے تھے۔ بسا اوقات ساری ساری رات بحث و مباحثے میں گزر جایا کرتی تھی اور فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ صورتحال پریشان کن ہو گئی تھی اور ہر طرف افراتفری کی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔ اور ایک بار ایسا بھی ہوا کہ عید کے سرکاری اعلان کو قبول نہ کرنے پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا احتشام الحق تھانویؒ اور مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ جیسے اکابر علماء کرام گرفتار کر لیے گئے اور انہیں کم و بیش ایک ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

اس پس منظر میں کچھ اصحابِ فکر نے دونوں وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلے کا حل پیش کیا کہ روزے یا عید کا اعلان تو سرکاری طور پر ہی ہونا چاہیے تاکہ باہمی خلفشار سے بچا جا سکے، لیکن یہ اعلان سرکاری اہلکاروں کی طرف سے نہ ہو بلکہ اس کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء کرام کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر دی جائے جو چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا شرعی اصولوں کے مطابق فیصلے کرے اور اس کا اعلان بھی وہی کرے، لیکن اس کے اعلان کو سرکاری اعلان کی حیثیت حاصل ہو تاکہ اس پر ملک بھر میں یکساں طور پر عملدرآمد ہو سکے۔

مجھے یاد ہے کہ مسئلہ کے اس حل کو عملی صورت میں لانے کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سب سے زیادہ فکرمند تھے، انہی کی کوششوں سے مختلف مکاتب کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا سرکاری طور پر قیام عمل میں لایا گیا تھا اور علماء کرام کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا کہ رؤیتِ ہلال کا نظام تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ اور نمائندہ علماء کرام کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے اور حکومت اس کمیٹی کے فیصلوں پر عملدرآمد کی ذمہ داری قبول کرے۔ اس طرح مختلف مکاتبِ فکر کے ذمہ دار حضرات کو مشورہ میں شریک کرنے کی روایت قائم ہوئی اور بڑے بڑے علماء کرام کی موجودگی کی وجہ سے آہستہ آہستہ اعتماد کی یہ فضا قائم ہوتی گئی کہ ملک کے اکثر حصوں میں رؤیتِ ہلال کا کوئی متبادل انتظام کرنے کی بجائے مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کو قبول کیا جانے لگا اور خوشگوار صورت سامنے آنے لگی کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کو اس سلسلے میں فیصلہ کن اور مجاز اتھارٹی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی چند مخصوص علاقوں میں اس سے الگ عمل ہوتا رہا مثلاً پشاور اور مردان وغیرہ میں اس سے ہٹ کر فیصلہ کیا جاتا تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا لیکن باقی پورے ملک میں مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پر اعتماد کرتے ہوئے مجموعی طور پر رمضان المبارک، عید الفطر اور عید

الاضحیٰ کا تعیّن متفقہ طور پر ہونے لگا۔

اس صورتحال میں رخنہ تب پیدا ہوا جب ایک سال صوبہ سرحد کی رؤیتِ ہلال کمیٹی نے رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا جس سے صوبہ سرحد کے ایک بڑے حصے میں رمضان اور عید کا نظام باقی ملک سے الگ ہو گیا۔ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا موقف یہ تھا کہ چونکہ وہ حکومت کی طرف سے مجاز اتھارٹی ہے اور اس نے رؤیتِ ہلال کی کوئی تسلی بخش شہادت نہ ملنے کی وجہ سے ۲۹ شعبان کی شام کو چاند نظر نہ آنے اور شعبان کے تیس دن مکمل کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اس لیے پورے ملک کو اس فیصلے کی پابندی کرنی چاہیے تھی۔ جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت اور رؤیتِ ہلال کمیٹی کا یہ کہنا تھا کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی نے چاند نہ ہونے کے فیصلے میں جلد بازی کی تھی اور فیصلے کے اعلان کے بعد موصول ہونے والی شہادتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اسے شرعی اصولوں کے مطابق شہادتوں کی بنیاد پر رمضان المبارک کے شروع ہو جانے کا اعلان کرنا پڑا۔ یہی صورتحال عید الفطر پر پیش آئی اور دو متضاد اعلانات کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے پریشانی کی صورتحال پیدا ہو گئی۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں رؤیتِ ہلال کے بارے میں اعلان کا حتمی اختیار صرف مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کو حاصل ہے یا علاقائی رؤیتِ ہلال کمیٹیاں بھی الگ طور پر یہ اختیار رکھتی ہیں؟ اور اگر علاقائی کمیٹیاں بھی یہ اختیار رکھتی ہیں تو جب صوبہ سرحد کی کمیٹی شہادتوں کی بنیاد پر رؤیتِ ہلال کا فیصلہ کر لیتی ہے تو کیا مرکزی کمیٹی کو اسے قبول کرنے میں کوئی تامل ہونا چاہیے؟ کیا صوبہ سرحد کی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی بنیاد پر ملک بھر میں عید کا اعلان نہیں کیا جا سکتا؟

صوبہ سرحد کے قدیمی دارالافتاء نجم المدارس کلاچی (ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) کی طرف سے ۲۰۰۶ء کے دوران یہ اعلان کیا گیا تھا کہ روزے، اعتکاف اور عید کے سلسلہ میں مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا اعلان ہی معتبر ہے، اور چونکہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی تمام مسالک کے جید علماء کرام پر مشتمل ہے، اس لیے اس سلسلہ میں اسی کے اعلان کو قبول کیا جانا چاہیے اور سب کو اسی پر عمل کرنا چاہیے۔

اجتہادی مسائل کے حوالے سے اصول یہ ہے کہ علماء کرام مل بیٹھ کر حالات اور ضروریات کی روشنی میں ان میں سے جس موقف پر بھی فیصلہ کر لیں وہی درست ہے، لیکن اس کا فیصلہ اجتماعی طور پر اور قومی سطح پر ہونا چاہیے۔ اگر قومی سطح پر باہمی مشاورت اور اعتماد کے ساتھ یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہم سعودی عرب کے ساتھ روزے اور عید کا نظام وابستہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، پھر مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی، لیکن اس فیصلے کی اصل جگہ اسلام آباد ہے اور تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے ساتھ قومی سطح کی مشاورت کے بعد ہی ایسا فیصلہ ممکن ہے۔ مگر جب تک ایسا کوئی فیصلہ اجتماعی طور پر نہیں ہو جاتا اور اسے قومی فیصلے کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک جو نظام رؤیتِ ہلال کے حوالے سے قومی سطح پر موجود ہے اس کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اس کے طرزِ عمل اور فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، اگر کوئی اختلاف دلیل کے ساتھ ہے تو وہ ضرور ہونا چاہیے، لیکن اس سے پہلے

اس نظام سے بغاوت کرنا اور لوگوں کو خلفشار کا شکار بنانا درست نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں اس معاملہ کو اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس ساری صورتحال کا جائزہ لے کر رؤیتِ ہلال کمیٹی کے لیے کوئی ایسا نظامِ کار اور ضابطۂ اخلاق طے کر دیں جس کی پابندی مرکزی اور صوبائی کمیٹیوں کے لیے ضروری ہو، ان کمیٹیوں کا باہمی اختلاف ایک ہی ملک بلکہ ایک ہی صوبہ اور علاقہ میں دو یا تین عیدوں کا باعث نہ بنتا رہے، اور کم از کم پاکستان کے تمام مسلمان تو ایک ہی دن متفقہ طور پر عید منا سکیں۔

ایک بات عام ذہنوں میں الجھن کا باعث بنتی ہے کہ پاکستان تو ایک ملک ہے، یہاں ایک روز متفقہ عید کیوں نہیں ہوتی؟ جبکہ مرکزی سطح پر رؤیتِ ہلال کمیٹی بھی قائم ہے جس میں تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام موجود ہیں اور انہی کے فیصلے پر چاند کے دیکھے یا نہ دیکھے جانے کا اعلان ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کی پرواہ نہیں کی جاتی اور عام طور پر ایک روز قبل عید منائی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کا تھوڑا سا پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے اس علاقہ کے لوگ جہاں زیادہ تر پشتون آباد ہیں، اپنے آپ کو کلچر اور ثقافت کے لحاظ سے افغانستان کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اور اپنی روایات و اقدار میں اپنے افغان بھائیوں کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ افغانستان میں ہمیشہ سے ایک روز پہلے عید ہوتی ہے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ وہاں کی غالب اکثریت حنفی ہے اور وہ احناف کے اصول کے مطابق اختلافِ مَطالع کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کے اعلان پر عید کر لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ افغانستان کی مغربی سرحد کا پاکستان کے ساتھ وقت کا اتنا فرق موجود ہے کہ پاکستان میں نظر نہ آنے والا چاند افغانستان کے مغربی حصے میں اسی روز نظر آسکتا ہے، اس لیے وہ ایک روز پہلے چاند دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے جب افغانستان میں عید ہو جاتی ہے تو افغانستان کی سرحد سے ملنے والے پاکستانی علاقوں میں عید نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

عالمِ اسلام کی سطح پر رؤیتِ ہلال کا نظام

عالمِ اسلام کی سطح پر رؤیت کے نظام اور اس کے فیصلہ کے طریق کار کا مسئلہ حل طلب ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا اور اس فیصلے کا نفاذ کس کی ذمہ داری ہوگی، کیونکہ خلافتِ عثمانیہ اور مغل حکومت کے خاتمہ کے بعد سے پورے عالمِ اسلام میں کوئی ایسا نظام اور ادارہ موجود نہیں ہے جو عالمِ اسلام کے حوالے سے کسی اجتماعی فیصلے کا مجاز ہو یا کسی فیصلے کے عملی نفاذ کی اتھارٹی رکھتا ہو۔ اس لیے میرے نزدیک عید ایک دن نہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ کوئی مرکزی نظام اور اتھارٹی موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے ہر مسلک اور علاقہ کے علماء کرام اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

چنانچہ اس صورتحال کا خاتمہ اس سے پہلے ممکن نظر نہیں آتا کہ خلافتِ اسلامیہ کا باقاعدہ قیام ہو اور وہ شرعی اتھارٹی کے طور پر رؤیتِ ہلال کا انتظام کر کے اس کے اعلان کی ذمہ داری قبول کرے، کیونکہ پھر کسی علاقہ کے علماء کرام کے لیے جداگانہ فیصلے کا جواز باقی نہیں رہ جائے گا اور پورا عالمِ اسلام ایک روز عید منا سکے گا۔

ہمارے ایک محترم دوست نے کہا کہ رویتِ ہلال میں اختلاف کی وجہ سے مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو غیر مسلموں کے سامنے اس پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ کہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ رویت کے بجائے فلکی حسابات پر رمضان و عیدین کا فیصلہ کیا جائے۔

مغربی ممالک میں مقیم اہلِ علم عموماً یہ بات کرتے ہیں اور اس میں نئی کوئی بات نہیں ہے۔ اس دلیل پر کچھ تبصرہ میں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا، وہی یہاں پیش کرتا ہوں۔

یہ دلیل بھی عموماً ذکر کی جاتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی وحدت کے لیے ضروری یہ ہے کہ روزہ و عید مختلف دنوں میں نہ ہوں۔ ڈاکٹر مظفر اقبال بجا طور پر فرماتے ہیں کہ روزہ و عید میں وحدت کا امت کی وحدت کے ساتھ جو تعلق جوڑا جاتا ہے وہ بالکل مصنوعی ہے اور ان دو امور کا آپس میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ تاہم مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے مسائل کے ضمن میں ڈاکٹر ذوالفقار علی شاہ اس دلیل کا بڑی شد و مد سے ذکر کرتے ہیں:

> هناك أمر آخر غاية في الأهمية وهو وحدة المسلمين، وكم هو محزن ومؤسف أن نري المسلمين متفرقين حتي في أعيادهم، وكم هو محرج ومؤلم للمسلمين وخصوصا الذين يعيشون في الغرب عندما يري أولادهم الصغار كيف أن المسلمين الكبار۔ الذين هم قدوة لهم۔ يرونهم متفرقين۔ فتري في البلد الواحد في الغرب في كل مسجد يصوم ويفطر علي هواه، فهذا يتبع اختلاف المطالع، وذاك يعتمد وحدة المطالع، وهذا يصوم مع السعودية والآخر يحتفل بالعيد مع بلده الأم، وكل مسجد يعيب علي الآخر، وكل مسجد يري أنه يطبق أمر الله، وأنه هو الذي علي الحق۔

(ایک اور پہلو بھی غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہے مسلمانوں کا اتحاد۔ یہ بات کتنی باعث شرم اور باعث افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنی عیدوں کے معاملہ میں بھی تفرقہ کا شکار دیکھتے ہیں، اور یہ بات مسلمانوں، بالخصوص ان کے لیے جو مغرب میں رہتے ہیں، کتنی باعث حرج اور کتنی اذیتناک ہے کہ ان کے چھوٹے بچے اپنے مسلمان بزرگوں کو، جو ان کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک دوسرے سے اختلاف کرتا دیکھتے ہیں۔ پس آپ دیکھتے ہیں کہ مغرب میں ایک ہی شہر میں ہر مسجد روزہ وفطر کا فیصلہ اپنی خواہشات پر کرتی ہے۔ کوئی اختلافِ مطالع کی اتباع کرتا ہے تو کوئی وحدۃ المطالع پر یقین رکھتا ہے، کوئی سعودیہ کے ساتھ روزہ رکھتا ہے تو کوئی اپنے آبائی وطن کے ساتھ، اور ہر مسجد دوسروں کو برا کہتی ہے اور ہر مسجد کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی تطبیق کر رہی ہے اور یہ کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہی حق ہے۔)

بابِ سوم میں ہم اس مسئلہ کے ایک پہلو پر تفصیلی بحث کر کے دکھائیں گے کہ یہ وحدت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک پوری دنیا کے مسلمانوں میں سیاسی وحدت قائم نہ ہو کیونکہ مہینہ شروع ہونے کا فیصلہ جو ہیئتِ مقتدرہ کرتی ہے وہ فیصلہ اس ہیئتِ مقتدرہ کی حدودِ ولایت تک ہی نافذ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان کی حکومت فیصلہ کرلے تو وہ افغانستان کی حدود میں نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہم ایک اور مقام پر فقہا کی یہ تصریح بھی نقل کر چکے ہیں کہ جن مقامات پر مسلمانوں کی حکومت نہ ہو وہاں کے مسلمانوں کو جن اہلِ علم پر اعتماد ہو انھی کے فیصلہ پر روزہ و عید کے معاملہ میں اعتماد کریں۔

عملاً بھی اس وقت یہی ہو رہا ہے۔ اگر تمام مسلمانوں یا ان کی اکثریت کا اتفاق ایک شخصیت یا ایک رائے پر نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ جسے جس شخصیت، یا جس رائے، پر اعتماد ہو، وہ اسی کی اتباع کرے گا۔ ایک اور مقام پر ڈاکٹر صاحب نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ جب نصوص کے ایک ہی مجموعے سے بعض فقہا اختلافِ مطالع کے اعتبار کے لیے اور بعض دیگر فقہا اس کے عدمِ اعتبار کے لیے استدلال کرتے ہیں تو کس کو حق پر سمجھا جائے؟

وإذا كان واحد من القولين صحيحاً ممثلاً لرأى النبى ﷺ، فهل معنى ذلك أن كل من اتبع الرأى الآخر أخطأ فى صيامه وأخطأ فى فطره؟ وإذا كان مقصد النبى هو واحد من القولين، فلماذا لم يوضحه بقول واضح الدلالة وضوحاً قطعياً يوفر فيه على المسلمين الاختلاف والوقوع فى الخطأ؟

(اگر ان دو اقوال میں ایک ہی صحیح اور رسول اللہ ﷺ کی رائے کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس نے دوسری رائے کی اتباع کی اس نے اپنے روزہ اور فطر میں غلطی کی؟ اور اگر نبی کا مقصد ان دونوں اقوال میں کوئی ایک ہی تھا تو کیوں نہ انھوں نے اسے ایسے واضح الدلالۃ اور قطعی الفاظ

میں واضح کیا کہ جس کے بعد مسلمانوں کے لیے اختلاف یا غلطی میں پڑنے کی گنجائش ہی نہ ہوتی ؟)

اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کے اس اعتراض کو مان لیا جائے تو یہی سوال ہر اس مسئلہ کے متعلق اٹھایا جاسکے گا جس میں اختلاف ہوا ہے۔ بات پھر رویتِ ہلال اور اختلافِ مطالع یا رفع الیدین اور قراءت الفاتحہ خلف الامام تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ جہاد کے متعلق بھی یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک الفاظ میں کیوں نہ قرار دیا کہ جہاد کی علت محاربہ ہے یا کفر؟ اموال ربویہ کے متعلق بھی پوچھا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے قطعی طور پر کیوں نہ بیان فرمایا کہ ان کی حرمت کی علت ان کا موزون اور مکیل ہونا ہے، یا ثمن اور مطعوم ہونا؟ یہ الجھن بھی پیدا ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک الفاظ میں کیوں نہ واضح کیا کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ وقس علی ذلک! یہ بھی ایک سوال ہے کہ کیا اختلافِ مطالع کے اعتبار یا عدمِ اعتبار کے مسئلہ یا کسی بھی اور مسئلہ میں اختلاف کو کسی مصنوعی طریقہ سے ختم کیا جاسکتا ہے؟

کیا اختلاف ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک اور اختلافی مسئلہ پر بحث اٹھائی جائے؟ کیا بعینہ ڈاکٹر شاہ کے انداز میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض مسلمان فلکی حسابات کو بنیاد بنانا چاہتے ہیں اور بعض اسے ناجائز سمجھتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کو کس طرح رفع کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اختلافی مسائل میں جو فریق جس رائے کو صحیح سمجھے گا وہ اسی کی اتباع کرے گا اور اپنے اس فعل کو اللہ کے امر کی تطبیق سمجھے گا۔ یہ بھی فطری امر ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک فریق دوسرے فریق کی رائے پر، جسے وہ غلط سمجھتا ہے، تنقید کرے گا۔ البتہ ظاہر ہے کہ عیب جوئی اور طعنہ زنی کو کسی صورت مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا اور اختلاف کے اظہار کے اپنے آداب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقیناً جانتے ہیں کہ کسی بھی نص کی تعبیر میں اختلاف کی وجہ صرف یہ نہیں ہوتی کہ اس نص کے الفاظ "قطعی الدلالۃ" ہیں یا نہیں؟

بلکہ کئی دیگر وجوہات بھی ہوتی ہیں، مثلاً دو یا زائد نصوص کا آپس میں تعلق، ایک نص کا دوسری نص کو مقیّد یا مخصوص کرنا، کسی خاص نص کا مخصوص سیاق و سباق اور پس منظر، کسی نص سے اخذ و استنباط کے اصول، نص سے استنباط کرنے والے کی مخصوص ذہنی تربیت اور اٹھان وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف کسی بھی قانونی نظام میں لازماً موجود ہوتا ہے اور اس کو کسی بھی مصنوعی طریقہ سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مغربی ممالک میں تو جمہوریت کی وجہ سے تکثیر، تنوع اور اختلاف رائے کو مستحسن سمجھا جاتا ہے اور اختلاف رائے کی صورت میں اکثریتی رائے پر عمل کے باوجود اقلیت کو اپنی رائے کے اظہار کا حق دیا جاتا ہے۔ نیز اقلیت کا یہ حق بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کو قائل کرنے کی کوشش کرے۔ ہر مغربی ملک میں کتنے ہی قانونی اصول ایسے ہیں جن پر لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے۔

پس اختلاف کوئی اتنی بھی "قابل شرم" چیز نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمان خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ اگر مسلمان بزرگ اپنے بچوں کو اختلاف کی حقیقت سے آگاہ کریں اور انھیں یہ بھی سمجھائیں کہ اختلاف ایک فطری چیز ہے تو یہ مسئلہ اتنا گھمبیر نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی اگر وہ ان کو فقہا کا یہ اصول بھی سمجھائیں تو ان کی تمام الجھنیں دور ہوجائیں

گی کہ اختلافی مسائل میں حق پر ایک ہی فریق ہوتا ہے لیکن اس حق کا قطعی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے۔ اس لیے اختلافی مسائل میں ہر مجتہد کو اس رائے پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے جسے وہ اپنے اجتہاد کی رو سے صحیح سمجھتا ہے اور ہر مجتہد کو اس کے اجتہاد کا ثواب ملے گا اگرچہ حق تک پہنچنے والے مجتہد کا اجر دگنا ہوگا۔

باقی رہا اس مسئلہ کا اصولی جواب تو وہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ مزعومہ مصالح کی بنیاد پر منصوص احکام کو معطل نہیں کیا جا سکتا بلکہ مصالح کو نصوص کے تابع کرنا ہوگا۔

(۷ فروری ۲۰۲۵ء)

رویتِ ہلال کے لیے قانون سازی کی ضرورت

رمضان قریب آگیا ہے۔ قوی امکان ہے کہ رویت ہلال کا مسئلہ ہمارے ہاں پھر ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن جائے گا۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے پر جگت بازی بھی ہوگی، تنقید بھی ہوگی، لیکن اس امر پر شاید ہی کوئی سنجیدہ بحث ہو کہ اس مسئلے پر ہمارے ہاں کوئی قانون کیوں ابھی تک نہیں بنایا جا سکا؟

برطانوی راج کے دور میں خیبر پختونخوا کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی مرکزیت کسی طرح حد تک قائم رہی، جیسے ریاستِ سوات اور ریاستِ دیر، وہاں عوام رمضان و عیدین کے معاملے میں ریاست کی حکومت کا فیصلہ مانتے رہے اور آج بھی وہ مرکزی کمیٹی کے ساتھ جڑے ہیں؛ لیکن جہاں ایسی مرکزیت باقی نہیں رہی تھی، جیسے میدانی اور قبائلی علاقے، وہاں لوگ حکومت کے بجائے مقامی علمائے کرام کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ خیبر پختونخوا میں کے بعض علاقوں میں افغان مہاجرین کی آمد کے بعد سعودی عرب کے فیصلے کی طرف بھی دیکھا جانے لگا کیونکہ افغان حکومت اس معاملے میں سعودی عرب کے فیصلے کی پابندی کرتی رہی ہے۔ گویا خیبر پختونخوا میں یہ تین رجحان پائے جاتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان میں "اختلافِ مطالع" کا مسئلہ بھی اٹھا۔

رویت ہلال کے مسئلے پر 1954ء میں علمائے کرام ایک طویل مباحثے کے بعد کسی حد اتفاقِ رائے تک پہنچ گئے لیکن ان کے فتوے کو ریاستی سطح پر عملاً نافذ نہیں کیا گیا۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے دوران میں "ترقی پسند" اور "جدید" اسلام کا ماڈل پیش کرنے کی کوشش میں رویت ہلال کے مسئلے پر بھی ایسے فیصلے کیے جن کی وجہ سے عوامی سطح پر بے چینی میں مزید اضافہ ہوا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے حکومتی سطح پر پہلی سنجیدہ کوشش ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوئی اور 23 جنوری 1974ء کو قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس کے نتیجے میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا نظام وجود میں لایا گیا۔ البتہ چونکہ یہ صرف قرارداد تھی اور اس موضوع پر باقاعدہ قانون سازی نہیں کی گئی، اس لیے اس قرارداد سے بعد میں بہت انحراف بھی کیا گیا۔ مثلاً قرارداد میں کمیٹی کے ارکان کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو اکثریتی ووٹ کے ذریعے ایک سال کے چیئرمین منتخب کرے۔ یہ بھی طے کیا گیا ہر سال اسی طرح نئے چیئرمین کا انتخاب ہوگا۔ معلوم امر

ہے کہ اب ایسا نہیں ہوتا۔

مرکزی کمیٹی کے فیصلوں کو اب بھی خیبر پختونخوا کے میدانی اور قبائلی علاقوں میں نہیں مانا جاتا اور یہ معاملہ صرف پشاور کی مسجد قاسم علی خان اور مولانا پوپلزئی تک محدود نہیں ہے، بلکہ مردان، چارسدہ، صوابی وغیرہ میں بھی لوگ مقامی علماء کی پرائیویٹ کمیٹیوں کا فیصلہ مانتے ہیں۔ ان علاقوں کے علمائے کرام کی جانب سے عام طور پر یہ گلہ بھی کیا جاتا ہے کہ خیبر پختونخوا سے آنے والی شہادتوں کو کمیٹی قبول نہیں کرتی۔

اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے رمضان کی رویت پر "روایت" کے احکام لاگو ہوتے ہیں، جبکہ شوال و ذی الحجہ اور دیگر 9 مہینوں پر "شہادت" یعنی گواہی کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس فرق کا قانونی اثر یہ ہے کہ رمضان کی رویت کی قبولیت میں کمیٹی کو بہت زیادہ شدت سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر بظاہر رویت کی روایت کرنے والا قابلِ اعتماد ہو تو بہت زیادہ چھان پھٹک اور غیر ضروری جرح نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح اس روایت کے راوی کا مجلسِ قضاء (کمیٹی کی میٹنگ) میں خود آنا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے "شہادۃ علی الشہادۃ" کا طریقِ کار اختیار کیا جاسکتا ہے۔ پھر چونکہ مواصلات کا نظام بہت ترقی کر گیا ہے، اس لیے ضلعی یا صوبائی کمیٹی تک رویت خبر پہنچ جائے، تو اور وہ اس کے نزدیک قابلِ اعتبار ہو، تو اس خبر کی مرکزی کمیٹی تک رسائی بہ آسانی ممکن ہے۔

عیدین کی رویت چونکہ گواہی ہے، اس لیے اس کے گواہ کا مجلسِ قضا میں آنا ضروری ہے، لیکن اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ مرکزی کمیٹی اس ضمن میں صوبائی اور ضلعی کمیٹیوں کے فیصلوں پر اعتماد کرے اور اس پر اصرار نہ کرے کہ اس نے خود گواہوں کی گواہی سنی ہے۔ اس شہادت کی قبولیت کے سلسلے میں شاہد پر مناسب جرح بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس ضمن میں بھی اختیار صوبائی اور ضلعی کمیٹیوں کو منتقل کرنا چاہیے۔

مرکزی کمیٹی کے ناقدین عموماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی شہادتیں آئیں لیکن انھیں مسترد کیا گیا۔ اصولاً جب تک قاضی گواہی کو قبول نہ کرے، اس کی حیثیت محض ایک خبر کی ہے اور دلائل و قرائن کی بنیاد پر قاضی گواہی کو مسترد بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے سچی بات یہ ہے کہ اس امر میں جانبین بے جا حساسیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

خیبر پختونخوا میں جب مذہبی جماعتوں کے اتحاد، متحدہ مجلسِ عمل، کی حکومت تھی تو صوبائی اسمبلی نے قرارداد منظور کی تھی کہ پاکستان میں وحدتِ رمضان و عیدین کو یقینی بنانے کے لیے رویت کے معاملے میں سعودی عرب کا فیصلہ قبول کرنا چاہیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ جمہور فقہائے کرام کے مطابق "اختلافِ مطالع" کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اس لیے سعودی عرب کی رویت پاکستان میں قبول کی جاسکتی ہے۔

اس موقف کی بنیاد سعودی عرب کے متعلق یہ خوش گمانی ہے کہ وہاں فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن کئی اہلِ علم نے رویت کے متعلق سعودی عرب کے نظام پر یہ تنقید کی ہے کہ وہاں فیصلے کی بنیاد رویت نہیں، بلکہ فلکی حسابات ہوتے ہیں اور جب ان حسابات کی رو سے چاند کی پیدائش ہو چکی ہو تو اس کے بعد ملنے والی رویت کی خبر کو وہ قبول

کر لیتے ہیں۔

شرعاً فلکی حسابات کی بنیاد پر چاند کی پیدائش کو مہینے کے آغاز کے لیے معیار نہیں بنایا جا سکتا، نہ ہی محض اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار کی رائے قبول کر کے اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اصل مسئلہ مطالع کے اختلاف کا نہیں بلکہ قانونی اختیار کی حدود کا ہے۔ سعودی عرب کی عدالت کا فیصلہ پاکستان میں نافذ نہیں ہو سکتا جب تک پاکستان کی عدالت اسے باقاعدہ طور پر قبول نہ کر لے۔ اس لیے ایسا تبھی ممکن ہو سکے گا جب حکومتِ پاکستان بعض دیگر مسلمان ممالک کی حکومتوں کی طرح یہ فیصلہ کر لے کہ وہ رویت کے متعلق سعودی عرب کا فیصلہ اپنے ملک میں نافذ کرے گی۔ تاہم اس فیصلے کا ایک ناپسندیدہ اثر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر مقامی سطح پر رویت کا اہتمام کرنے میں بہت زیادہ تساہل برتا جائے گا۔

رویت ہلال کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ اس سلسلے میں باقاعدہ قانون سازی کی جائے۔ ایسی کسی قانون سازی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہی 2009ء میں سپریم کورٹ نے، جبکہ افتخار محمد چودھری صاحب چیف جسٹس تھے، اس سلسلے میں پٹیشن کی سماعت سے معذوری ظاہر کی۔ 2016ء میں حکومت نے اس مقصد کے لیے قانون کا ایک مسودہ تیار کیا تھا، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ تاحال وہ مسودہ سرد خانے میں پڑا ہے۔

(۷ فروری ۲۰۲۵ء)

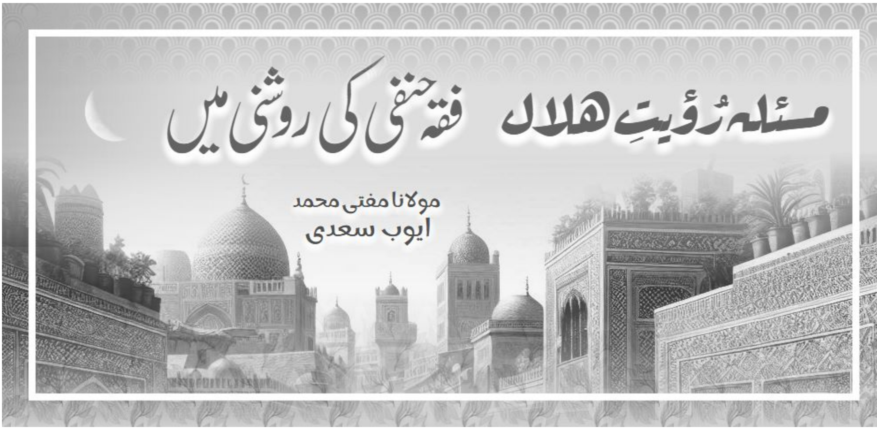

(شعبہ نشر و اشاعت جامعہ عربیہ سراج العلوم لکی مروت کے شائع کردہ رسالہ
"جرعة الزلال فی مسئلة رؤية الهلال" طبع ۱۴۳۸ھ کا ایک حصہ)

سوال: بابت رؤیتِ ہلالِ رمضان و عید الفطر

رمضان شریف اور عید الفطر کے وقت ہمارے لکی مروت کے ضلع میں تقریباً دو سالوں سے کافی انتشار اور خلفشار پیدا ہو چکا ہے جس میں عوام اور نوجوان علماء طبقہ کافی پریشان ہے۔ بعض عوام علماء کے ایک خاص طبقہ کی شہادت پر روزہ رکھ کر، بعض دوسرے علماء زبردستی عوام کو روزہ افطار کرا کے مذکورہ شہادت کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پورے پاکستان میں روزہ نہیں ہے تو آپ کا روزہ بھی معتبر نہیں۔ اور جب عید الفطر کی شہادت لے کر علماء عید کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے مقابل علماء اس شہادت کی تردید کر کے کہتے ہیں کہ کل روزہ رکھنا فرض ہے، جب تک مرکزی رؤیتِ ہلال اور اس کے چیئرمین کی طرف سے عید کا اعلان نہ ہو عید منانا حرام ہے کیونکہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت شرعی قاضی کی ہے۔ اس میں فقہاء احناف کی فقہ کی روشنی میں مدلل فتویٰ کیا ہے؟ بینوا و توجروا۔

الجواب باسم الموفق الصواب

پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ کے عوام بہ نسبت دوسرے صوبوں کے صوم و صلوٰۃ کے زیادہ پابند ہیں، وہ عبادات میں فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں عوام اور خواص کے گھروں میں نفلی روزوں کا اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بعض گھروں میں تو جشن کا سماں ہوتا ہے کہ آج شبِ معراج ہے اور آج شبِ برأت ہے آج بارہ وفات ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض دیندار عوام کے گھروں میں خوشیوں کے سمندر

ٹھاٹھیں مارنا شروع کردیتا ہے تو ایسے لوگوں کو چاند تلاش کیے بغیر کیسے قرار ہو سکتا ہے جب کہ حکم بھی یہی ہے۔

یجب ان یلتمس الناس الهلال فی التاسع والعشرین من شعبان وقت المغرب فان رأوه صاموا وان غم اکملوه ثلاثین یوما کذا فی الاختیار شرح المختار (عالمگیری ج ا ص ۱۹۷)

ترجمہ: لوگوں پر لازم ہے کہ وہ انتیس شعبان کے مغرب کو چاند دیکھنے کا اہتمام کریں، اگر چاند دیکھ لیا تو روزہ رکھ لیں ورنہ تیس دن (شعبان) کے پورے کر لیں۔

یہ کسی ایک عالم کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ پانچ سو جید علماء ہند کا فتویٰ ہے جنہوں نے عالمگیری مرتب کی ہے۔ نیز آلاتِ جدیدہ سے مدد لینے والے ماہرین کی بات چاند کے وجود و عدمِ وجود کے بارے میں غیر مقبول ہے جیسا کہ عالمگیری میں سراج الوھاج کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

وهل یرجع الی قول اهل الخبرة العدول ممن یعرف علم النجوم الصحیح انه لا یقبل کذا فی السراج الوهاج (عالمگیری ج ا ص ۱۹۷)

ترجمہ: کیا اس بارے میں ستاروں کی مدد سے اوقات کا حساب کرنے والے ماہرینِ علمِ نجوم کی بات قابلِ اعتماد ہے؟ صحیح یہ ہے کہ ان کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔

علامہ حصکفیؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے:

ولا عبرة بقول الموقتین۔

علامہ شامی کہتے ہیں:

ای فی وجوب الصوم علی الناس بل فی المعراج لا یعتبر قولهم بالاجماع

اور تھوڑا سا آگے لکھتے ہیں:

و فی النهر فلا یلزم بقول الموقتین انه ای الهلال یکون فی السماء بعلة کذا وان کانوا عدولا فی الصحیح کما فی الایضاح (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۸۷)

فقہ حنفی میں ردالمحتار کا ایک مقام ہے، مفتیان کرام کے پاس اس کی بات آخری بات ہوتی ہے۔ رؤیتِ ہلال کا ثبوت شہادت پر موقوف ہے اور امورِ شہادت میں شہادت ہی معتبر ہوتی ہے۔ اور فرماتے ہیں:

لان الشهادة نزلها الشارع منزلة الیقین

(شارع علیہ السلام نے شہادت کو یقین کا قائم مقام قرار دیا ہے)

شرعی نقطہ نظر سے پورے ملک میں ایک ہی دن روزہ رکھنا یا ایک ہی دن عید منانا نہ فرض ہے نہ واجب اور نہ شرعًا ضروری ہے۔ قرآن وحدیث کے پورے ذخیرے سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا۔

رؤیتِ ہلال کے مسئلہ میں مندرجہ ذیل چیزوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۱. ذیلی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت۔

۲. ذیلی کمیٹیوں کی شہادت لینے کے بعد اعلان کی حیثیت۔

۳. گورنمنٹ کے مقرر کردہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اور اس کے چیئرمین کی شرعی حیثیت اور ان کے اختیارات۔

۴. مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اگر ذیلی کمیٹیوں کی شہادت علی الرؤیۃ قبول نہ کرے تو ذیلی کمیٹی سے ملحق اطراف واکناف کیلئے یہ شہادت معتبر ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ کے مذکورہ چار اجزاء کا بالترتیب حل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) رؤیتِ ہلال کے بارے میں ذیلی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت

اگر کسی ملک میں فیصلے قرآن وحدیث پر ہونا محال ہو اور وہاں کوئی شرعی قاضی بھی نہ ہو اور عوام اپنی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے علماء کرام مفتیان عظام کی رہنمائی کے محتاج ہوں وہاں پر فقہاء کرام نے ثقہ، معتمد علیہ اور متدین علماء کرام کو شرعی قاضی کے قائم مقام قرار دیا ہے اور کسی بھی ضرورت کے وقت ان کا مدلل فتویٰ شرعی حکم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رؤیتِ ہلال کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لئے پاکستانی عوام خصوصًا خیبر پختون خواہ کے دینی جذبہ سے سرشار اور دینی حمیت کے حامل عوام چاند دیکھنے کے بعد چاند کی شہادت پیش کرنے کیلئے علماء کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ اور یہ صرف عید الفطر کے وقت نہیں ہوتا بلکہ رمضان کے ثبوت کے وقت بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ روزہ رکھنے اور افطار کرنے کو دیندار عوام ایک شرعی فریضہ کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ذیلی کمیٹی سے متعلق علماء کرام بھی اس کو شرعی امر سمجھتے ہوئے شہادت لے کر روزہ یا فطر کا حکم سناتے ہیں جو عین شرعی حکم ہی ہوتا ہے۔

لما فی الشامیة لان الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين (ردالمحتار)
(یعنی شارع نے شہادت کو یقین کے قائم مقام قرار دیا ہے)

اما فی السواد اذا رأى احدهم هلال رمضان يشهد فی مسجد قريته وعلى الناس ان يصوموا بقوله بعد ان يكون عدلا اذا لم يكن هناك حاكم يشهد عنده كذا فی المحيط (عالمگیری ج ۱ ص ۱۹۷)

یعنی مصر کے علاوہ دیہاتوں میں اگر کوئی دیہاتی رمضان شریف کا چاند دیکھے تو اپنے گاؤں کی مسجد میں گواہی دے تو ان لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی گواہی قبول کر کے روزے رکھیں۔

محیط کی عبارت میں اما فی السواد کی قید احترازی نہیں بلکہ قید واقعی ہے یعنی دیہاتوں میں شرعی قاضی کا وجود واقعۃً مفقود ہے تو اسی طرح جن شہروں میں شرعی قاضی نہ ہو تو وہاں پر فقہاء کرام جید علماء کرام کے حکم کو قاضی کے حکم کے قائم مقام قرار دیتے ہیں۔

علامہ قاضی خان کا فتویٰ یہ ہے:

ومن رأى هلال رمضان في الرستاق وليس هناك وال ولا قاض فان كان الرجل ثقة يصوم الناس بقوله۔

یعنی اگر کسی نے دیہات میں چاند دیکھا اور وہاں پر کوئی شرعی والی یا قاضی نہیں تھا تو لوگ ثقہ ہونے کی وجہ سے اس کے اس قول (کہ میں نے چاند دیکھ لیا) پر روزے رکھنے شروع کر دیں۔

نوٹ: فقہاء کرام نے شرعی قاضی کی ضرورت محسوس کیے بغیر لوگوں کو اس بات کا پابند بنا دیا کہ لوگ اس کی بات کا اعتبار کر کے روزہ رکھیں۔

وفی الفطر ان اخبر عدلان برؤية الهلال لا بأس بان يفطروا۔

ترجمہ: اور عید الفطر میں اگر دو عادل آدمی رؤیتِ ہلال کی خبر دیں (تو ان کی بات مانتے ہوئے) لوگوں کو روزہ افطار کرنے (اور عید منانے میں) کوئی حرج نہیں۔

(۲) ذیلی کمیٹیوں کا شہادت لینے کے بعد اعلان کی شرعی حیثیت

شہادت کی اہلیت کیلئے مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، عادل ہونا شرط ہے جو خیبر پختون خواہ کے عوام میں کامل درجہ میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ شہادت پر مبنی امور میں شہادت ہی معتبر ہے تو متشرع عادل گواہوں کی شہادت کا اعتبار کیوں نہیں کیا جاتا اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین سماعِ شہادت یا شہادت علی الرؤیۃ کی تکلیف کیوں گوارا نہیں کرتے؟ جب کہ فقہاء کرام نے قاضیٔ وقت کے علاوہ بھی ذیلی کمیٹیوں کیلئے شہادت لینے اور رمضان، عید کا اعلان کرنے کی گنجائش چھوڑی ہے۔ امام فخرالدین حسن بن منصورؒ جو کہ قاضی خان کے نام سے مشہور ہے، لکھتے ہیں:

وروى انه يقبل فيه شهادة اهل محلة وان جاء الواحد من خارج المصر و شهد برؤية الهلال ثمه روى انه تقبل شهادته واليه اشار فى الاصل وكذا لو شهد برؤية الهلال فى المصر على مكان مرتفع واما هلال شوال فان كان بالسماء علة لا يقبل الا شهادة رجلين او رجل وامرأتين و يشترط فيه

الحرية وكما تشترط فيه الحرية و العدد ينبغي ان يشترط فيه لفظ الشهادة۔ (قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج ا ص ۱۹۶)

ترجمہ: اور منقول ہے کہ رمضان شریف کے بارے میں اہلِ محلہ کی شہادت قبول کی جائے گی اور اگر کوئی ایک آدمی شہر کے باہر سے آئے اور وہاں چاند دیکھنے کی گواہی دے دے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور اسی کی طرف مبسوط میں اشارہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چاند دیکھنے کی گواہی شہر میں کسی اونچی جگہ دے (تو اس کی گواہی بھی قبول کی جائے گی) اور شوال کا چاند دیکھنے میں اگر آسمان پر کوئی علت ہو تو دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول کی جائے گی۔ اور اس شہادت دینے میں حریت شرط ہے اور جس طرح شہادت میں حریت اور عددِ شہادت شرط ہے اسی طرح لفظ شہادت کا شرط ہونا مناسب ہے۔

خارج المصر کی قید سے دیہاتیوں کی اہمیت اور بڑھ گئی کیونکہ وہاں پر چاند دیکھنے کیلئے کھلی فضا کا ہونا زیادہ معاون ہے جیساکہ قاضی خان کا مذکورہ حوالہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

ومن رأى هلال رمضان فى الرستاق وليس هناك وال ولا قاض فان كان الرجل ثقة يصوم الناس بقوله

یعنی جس نے دیہات میں رمضان کا چاند دیکھ لیا اور وہاں پر والی اور قاضی نہیں تھا پس اگر آدمی ثقہ تھا تو لوگ اس کے کہنے پر روزے رکھنے (شروع کر دیں)۔

اسی طرح عید الفطر میں دو عادل گواہوں کی شہادت پر عید کا اعلان شرعًا معتبر ہے۔

جاننا چاہئے کہ ذیلی کمیٹیوں کا وجود تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے اور دیگر دینی مسائل میں عموماً اور چاند کی شہادت میں خصوصًا لوگ اپنے اپنے علاقے کے جید اور نامور علماء کرام ہی پر اعتماد کرتے ہیں اور انہی مواقع میں ان کی طرف رجوع کر کے انہی کے اعلانات کا انتظار کرتے ہیں۔ عرفِ عام یہ ہے کہ عوام جید اور نامور علماء کو شرعی قاضی کے حکم کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو شرعی قاضی کا درجہ دیتے ہیں اس لئے تو تمام دینی مسائل میں انہی کی راہنمائی حاصل کیے بغیر مطمئن نہیں ہوتے۔

جید اور نامور علماء کرام کے تحت چلنے والی ذیلی کمیٹیوں کا وجود ایک جگہ نہیں ہوتا بلکہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں پشاور، مردان، میرانشاہ، بنوں اور لکی مروت کے شہروں اور ان کے مضافات میں جگہ جگہ ہوتا ہے جہاں پر شرعی شہادتوں کی بنیاد پر رمضان اور عید الفطر کے اعلانات ہوتے ہیں۔ ان تمام شہروں میں رمضان اور عید الفطر کے چاند دیکھنے کا اہتمام ہوتا ہے اور ایک ہی دن میں کئی شہروں کے کمیٹیوں کے پاس شرعی شہادتیں موصول ہو جاتی ہیں۔ کئی شہروں میں مختلف گواہوں کا جھوٹ پر اجتماع ناممکن ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایسی شہادتوں کے قبول ہونے کی اجازت دی ہے:

وقال ابویوسف انما تقبل شهادة رجلین علی هلال شوال اذا اخبرا انهما رأیاه فی غیر البلد وان کانت شهادتهما انهما رأیاه في البلد و البلد کثیر الاهل لا یقبل فیهما قول الواحد والاثنین وانما یقبل قول جماعة لا یتصور اجتماعهم علی الکذب (قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج ا ص ۱۹۷)

ترجمہ: امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ بیشک شوال کے چاند کے بارے میں دو مردوں کی شہادت قبول کی جائے گی جب کہ وہ اس کے دیکھنے کی خبر شہر کے علاوہ میں دیں۔ اور اگر وہ گواہی دیں کہ انہوں نے شہر میں چاند دیکھ لیا ہے اور شہر کے باشندے زیادہ ہوں تو ایک یا دو کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی بلکہ ایک ایسی جماعت کی گواہی ضروری ہے جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔

یہ ہے امام ابویوسفؒ کا حکم کہ شوال کی چاند دیکھنے کیلئے دو دیہاتوں کی گواہی قبول کی جائے گی اور ان کو اپنی شہادت کی بنیاد پر عید منانے کی اجازت دے دی۔

ایک ضروری وضاحت:

چاند دیکھنے میں تفصیل ہے۔ پہلی رات کی چاند ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا جب کہ افق گردآلود بھی ہو، اس لئے تو فقہاء کرام نے رمضان کیلئے ایک آدمی کی شہادت کو بھی معتبر قرار دیا ہے۔ حوالہ ملاحظہ ہو:

ان کان بالسماء علة فشهادة الواحد علی هلال رمضان مقبولة اذا کان عدلا مسلما عاقلا بالغا الخ (عالمگیری ج ا ص ۱۹۷)

ترجمہ: جب آسمان پر کوئی علت (گرد و غبار) ہو تو ہلالِ رمضان کے بارے میں ایک آدمی کی گواہی قبول کی جائے گی جبکہ وہ عادل، مسلمان، عاقل اور بالغ ہو۔

عالمگیری مرتب کرنے والے پانچ سو علماء کرام کا اس فتویٰ پر اتفاق اور اجماع ہے۔

اسی طرح عیدالفطر کے بارے میں فقہاء کرام کا فتویٰ یہ ہے:

واذا اخبر رجلان فی هلال شوال فی السواد والسماء متغیمة ولیس فیه وال ولا قاض فلا بأس للناس ان یفطروا کذا فی الزاهدی و تشترط العدالة هکذا فی النقایة۔ (عالمگیری ج ا ص ۱۹۸)

ترجمہ: جب ہلالِ شوال کے بارے میں دیہات کے دو آدمی گواہی دیں جبکہ آسمان ابرآلود ہو اور وہاں کوئی والی یا قاضی نہ ہو تو لوگوں کا افطار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح زاہدی میں لکھا ہے

جب کہ نقایہ میں عدالت کو شرط قرار دیا گیا ہے۔

افق گرد آلود ہونے کی صورت میں عید الفطر کیلئے پورے آبادی میں صرف دو آدمیوں کی گواہی کو کافی قرار دیا گیا۔

ولیس فیه وال ولا قاض کے جزئیہ نے تو اور بھی مسئلہ سے پردہ ہٹالیا اور دیہات سے شہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ سواد شہروں کے آس پاس ہوتے ہیں، اسلامی حکومت میں شہروں میں تو ضرور شرعی قاضی موجود ہوتا ہے۔

قاضی خان کے مذکورہ حوالہ (یصوم الناس بقوله) نے ذیلی کمیٹیوں کی طرف شہادت اور ان کے اعلانات کو تقویت بخشی، اسی طرح عالمگیری نے خلاصتہ الفتاویٰ کے حوالہ سے لکھا ہے:

وان جاءوا من مکان بعید جازت شهادتهم لانتفائا لتهمة (عالمگیری ج اس ۱۹۸)

ترجمہ: اگر گواہ کسی دور جگہ سے آجائیں تو انتفاء تہمت کی وجہ سے ان کی شہادت (قبول کرنا) جائز ہے۔

نوٹ: بہت افسوس ہے کہ فقہاء کرام دور سے آنے والے گواہوں سے تہمت ہٹاتے ہیں اور ہم تہمت لگاتے ہیں۔

اسی طرح عالمگیری نے شمس الائمہ الحلوانی کا فتویٰ نقل کیا ہے:

قال لو رأی اهل مغرب هلال رمضان یجب الصوم علی اهل مشرق کذا فی الخلاصة۔ (عالمگیری ج اص ۱۹۹)

ترجمہ: اگر اہلِ مغرب نے رمضان کا چاند دیکھ لیا تو اہلِ مشرق پر روزہ واجب ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق کیلئے ایک ہی قاضی ہو گا؟ اور اگر امامِ وقت اور حاکمِ وقت مشرق میں ہے اور ذیلی کمیٹی کی شہادت مغرب میں ہے تو جس طرح مشرق میں دیگر باشندوں پر روزہ واجب ہے اسی طرح حاکمِ وقت اور دیگر قضاۃ پر بھی واجب ہے؟

تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں خیبر پختونخواہ کے شرعی شہادت کی وجہ سے بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے عوام اور خواص پر بھی روزہ فرض ہوا۔ روزہ نہ رکھنا فرض رمضان اور شہادت کی تردید کے مترادف ہے جو کہ سخت گناہ اور شرعی جرم ہے۔

اسی طرح شمس الائمہ الحلوانی کا ایک دوسرا فتویٰ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

قال شمس الائمة الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض و تحقق فیما بین اهل البلدة الأخری یلزمهم حکم هذه البلدة ومثله فی الشر نبلالية عن المغنی (ردالمختار ج ۲ ص ۳۹۰)

ترجمہ: شمس الائمۃ الحلوانی فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جب خبر دوسرے شہر کے لوگوں میں مشہور اور ثابت ہو جائے تو ان پر اس شہر کا حکم لازم ہوگا۔

اس فتویٰ میں کسی ایک شہر کی شائع شدہ خبر حکم کے قائم مقام قرار دے کر دوسرے شہروں پر اس حکم کا ماننا لازم قرار دیا، اگر کوئی اس حکم سے انکار کرے تو کیا یہ شرعی حکم کا انکار نہیں ہے؟ جو کہ شرعی جرم ہے۔

علامہ شامیؒ مزید فرماتے ہیں کہ صرف خبرِ مشاع معتبر نہیں بلکہ خبرِ مستفاض کا متحقق ہونا شرط ہے۔ اور لکھا ہے کہ خبرِ مستفاض کے متحقق ہونے کے بعد حلِ فطر اتفاقی ہے۔ علامہ نوح آفندیؒ کے فتویٰ (کہ حلِ فطر اتفاقی ہے) سے علامہ شامیؒ نے اس کی توثیق کی ہے اور بدائع الصنائع، سراج الوھاج اور جوھرۃ النیرۃ کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اتفاق سے مراد ہمارے تین اماموں (امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ) کا متفق ہونا ضروری ہے۔

تنویر الابصار ص ۳۹۰ میں لکھا ہے:

و بعد صوم ثلاثین بقول عدلین حل الفطر۔

یعنی دو عادل گواہوں کے قول پر جب رمضان شریف کا حکم سنایا گیا ہو تو تیس روزے پورے ہونے کے بعد عید الفطر منانا جائز ہے۔

تو کیا شریعت میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ پورے خیبر پختونخواہ کے خواص اور عوام کا عید ہو اور چند ایک علماء انتشار پھیلانے کیلئے بضد ہو کر رمضان شریف کو جاری رکھنے کا اعلان کرتے رہیں اور اکتیسواں روزہ شروع کر دیں؟ کیونکہ پہلا روزہ تو شرعی شہادت کی بنیاد پر لوگوں نے رکھا تھا۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

تقدم انهم لو كانوا فی بلدة لا قاضی فيها ولا وال فان الناس يصومون بقول الثقة ويفطرون باخبار عدلين للضرورة (بحرالرائق ج ۲ ص ۲٦٧)

یعنی یہ بات پہلے گزر چکی کہ اگر وہ ایک ایسے گاؤں میں تھے کہ وہاں پر کوئی (گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کردہ) قاضی یا والی نہیں تھا پس وہ لوگ کسی بھی ثقہ گواہ کے قول پر روزے رکھیں اور دو عادل گواہوں کی خبر پر عید منائیں (کیونکہ یہ) شرعی ضرورت ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

واما اذا صاموا بشهادة اثنين فانهم يفطرون اتفاقا۔

یعنی اگر دو گواہوں کی گواہی پر لوگوں نے روزہ رکھا تھا تو بلا خلاف ان کیلئے عید منانا جائز ہے۔

اور تھوڑا سا آگے لکھتے ہیں:

و اعلم ان ما كان من باب الديانات فانه يكتفى فيه بخبر الواحد العدل كهلال رمضان وما كان من حقوق العباد و فيه الزام محض كالبيوع والاملاك فشرطه العدد والعدالة ولفظ الشهادة مع باقى شروطها ومنه الفطر الخ (بحر ج ٢ ص ٢٦٧)

یعنی یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ دیانات کے باب سے جو مسائل متعلق ہوں اس میں رمضان کی طرح عدالت سے موصوف خبرِ واحد کی گواہی کافی ہے۔ اور جو مسائل حقوق العباد کی باب سے متعلق ہوں اور اس میں بیوع اور املاک کی طرح الزامِ محض ہے اس گواہی میں باقی شروط سمیت شہادت کے تین اہم شرائط عدد، عدالت اور لفظ شہادت کا ہونا ضروری ہے، اور ان حقوق العباد میں سے ایک عید الفطر بھی ہے۔

اور علامہ ابن نجیم مصریؒ آگے لکھتے ہیں:

و روى الحسن عن ابى حنيفة انه يقبل فيه شهادة رجلين او رجل و امرأتين سواء كان بالسماء علة اولم يكن كما روى عنه فى هلال رمضان كذا فى البدائع ولم ار من رجحها من المشائخ و ينبغى العمل عليها فى زماننا لان الناس تكاسلت عن ترائى الاهلة الخ

حسن بن زیاد امام اعظم ابو حنیفہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ عید الفطر میں دو آدمیوں یا ایک آدمی اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہے اگر مطلع صاف ہو یا نہ ہو جیسا کہ ہلالِ رمضان کے بارے میں ان سے روایت ہے۔ اسی طرح بدائع میں لکھا ہے: علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ مشائخ میں سے کسی نے اس قول کو ترجیح نہیں دی لیکن ہمارے زمانے میں اس قول پر عمل کرنا مناسب ہے کیونکہ چاند دیکھنے میں لوگ سست ہو گئے۔

آگے لکھتے ہیں:

وان لم يكن بالسماء علة فيهما يشترط ان يكون فيها الشهود جمعا كثيرا يقع العلم بخبرهم اى علم غالب الظن لا اليقين۔

یعنی اگر مطلع صاف ہو اور آسمان گرد آلود نہ ہو تو گواہوں کا جمع کثیر ہونا شرط ہے (جمع کثیر کا فائدہ یہ ہو گا کہ اگر) ان کے خبر پر یقین کے ساتھ نہیں بلکہ غلبہ ظن کے ساتھ تو علم ضرور واقع ہو گا۔

(۳) مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اور اس کے چیئرمین کی شرعی حیثیت

جیسا کہ لکھا گیا کہ عرفِ عام میں عوام نے علماء کرام کو شرعی قاضیوں کا درجہ دیا ہے تو یہ عرفِ عام شریعت میں (۴) مرکزی رویت معتبر ہے۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ الثابت بالعرف کالثابت بالنص تو عرفِ عام کی مخالفت نصِ صریح کی مخالفت ہے جو کہ جائز نہیں۔ تنویر اور اس پر در مختار نے لکھا ہے کہ:

(شهدوا انه شهد عند قاضی مصر كذا شاهدان برؤية الهلال) فی ليلة كذا (وقضى) القاضی (به ووجد استجماع شرائط الدعوى قضى) ای جاز لهذا (القاضی) ان يحكم (بشهادتهما) لان قضاء القاضی حجة قد شهدوا به لا لو شهدوا برؤية غيرهم لانه حكاية۔

ترجمہ: لوگوں نے گواہی دی کہ فلاں شہر کے قاضی کے ہاں دو گواہوں نے فلاں رات چاند دیکھنے کی گواہی دی اور قاضی نے اس پر فیصلہ کیا اور دعویٰ کے تمام شرائط موجود تھے۔ تو اس قاضی کیلئے جائز ہے کہ ان کی گواہی پر فیصلہ دے کیونکہ قاضی کا فیصلہ (شرعی) حجت ہے اور لوگوں نے اس کی گواہی دی، لیکن کسی اور کے دیکھنے پر گواہی دینا صحیح نہیں کیونکہ یہ حکایت ہے۔

جاز لہٰذا القاضی نے ثابت کر دیا کہ ملک کے کسی بھی صوبے میں عوام الناس کے ہاں معتمد علیہ جید علماء کرام کے رؤیۃ ہلال کے احکامات صادر ہونے کے بعد مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کیلئے شرعًا یہ جواز موجود ہے کہ ذیلی کمیٹیوں کے احکامات کو قبول کر کے اس شہادت کی شرعی اطمینان حاصل کر کے پورے ملک میں رمضان یا عید الفطر کا اعلان کرے۔ تو یہ انتشار سے بچنے کی بہترین صورت ہے۔ اور قبول نہ کرنے کی صورت میں الٹا صوبے کے گواہوں کی شرعی شہادت کا مذاق اڑانا شرعًا ناجائز ہے بلکہ گناہِ کبیرہ اور حرام ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال ایسا ہوا کہ مرکزی کمیٹی نے پشاور کے دس پندرہ عادل گواہوں کو مسترد کیا، اور کل بلوچستان کے صرف تین گواہوں کی شہادت پر پورے ملک میں عید کا اعلان کیا گیا حالانکہ کل کو مغرب کے بعد تقریبًا ہر کسی نے چاند دیکھ لیا جب کہ پہلی رات کا چاند ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا چند ایک لوگ دیکھتے ہیں۔ تو پوچھنا یہ ہے کہ بلوچستان کے تین گواہوں کے بارے میں آسمان سے وحی آگئی کہ ان کو قبول کیا گیا؟ اور پشاور کے دس پندرہ گواہ کیا شرعًا مردود الشھادۃ تھے یا ان میں شہادت کی اہلیت نہیں تھی؟ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک نقطہ ہے جو پورے ملک میں باعثِ انتشار بنا ہوا ہے۔

فقیہِ ملت مفتی محمود رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حکومتِ وقت نے جو موجودہ ہلال کمیٹی مقرر کی ہے اس کے ارکان پر علماء وقت کو چونکہ اعتماد نہیں ہے کہ یہ ارکان شرعی احکام کی رعایت رکھ کر ہی فیصلہ فرماتے ہیں اس لئے موجودہ کمیٹی کے فیصلہ کے اعلان پر عمل کرنا سب پر لازم نہ ہوگا۔ تھوڑا آگے حضرت مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چونکہ موجودہ حکومت نے

ابھی تک ثقہ علماء کی جماعت کو ہلال کمیٹی میں نہیں لیا ہے اور حکومت قواعدِ شرع کی پابندی نہیں رکھتی اس لئے اس کا فیصلہ واجب العمل نہ ہوگا اور محض اس پر اعتماد کر کے روزہ توڑنا جائز نہ ہوگا۔ (فتاویٰ مفتی محمود ج ۳ ص ۴۲۱-۴۲۰)

حضرت مفتی صاحبؒ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ موجودہ ہلال کمیٹی کے ارکان شرعی احکام کی رعایت نہیں کرتے اس لئے علماء وقت کو اس پر اعتماد نہیں ہے اور قواعدِ شرع کی پابندی نہیں رکھتی اس لئے اس کا فیصلہ واجب العمل نہ ہوگا اور محض اس پر اعتماد کر کے روزہ توڑنا جائز نہ ہوگا۔ کچھ سمجھ آگئی کہ جو علماء کئی درجن علماء کے رمضان کا اعلان مسترد کر کے استہزاء کرتے ہیں اور روزہ داروں کو روزہ تڑواتے ہیں تو اس ناجائز عمل کا آخرت میں کیا جواب دیں گے؟ تو حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا کہ علماء وقت کو اس پر اعتماد نہیں ہے تو کیوں خیبر پختونخواہ کے عادل گواہوں کی شہادت لینے والے جید علماء کرام کے حکم پر عمل نہ کیا جائے اور اس کو نافذ العمل نہ مانا جائے۔ فوا اسفا۔

تھوڑا سا داد دیجئے ان علماء کو جو پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے جگہ جگہ اپنی علمی دبدبہ چمکاتے ہوئے ان سادہ لوح عوام کو روزہ افطار کراتے ہیں جنہوں نے پورے خیبر پختونخواہ میں نافذ ہونے والے شرعی شہادت کے اتباع میں روزہ رکھا ہو۔ کیا یہ دین ہے یا کہ بے دینی؟ خود انصاف کیجئے اور شرعی شہادت کی استہزاء اور تمسخر اڑانے پر بھی غور کیجئے۔

فتاویٰ مفتی محمود رحمہ اللہ میں ایک سوال درج ہے، موضع لساوری تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ (کے) پانچ آدمیوں نے کہا اور قسم اٹھائی کہ ہم نے چاند پیر کی رات شام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے آپ اطلاع کیلئے ڈھول بجوادیں۔ اطلاع کیلئے ڈھول بجوایا گیا جہاں تک ڈھول کی آواز پہنچی، لوگوں نے روزہ بروز سوموار نہیں رکھا۔ لیکن جب آس پاس کے علماء کی طرف رجوع کیا گیا تو علماء علاقہ نے اس کی شہادت کا اعتبار نہیں کیا اور کہا کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں چاند نہیں دیکھا گیا الخ۔ سوال کے آخر میں لکھتے ہیں دریافت طلب امر یہ ہے کہ چونکہ صرف پانچ آدمیوں نے چاند دیکھا اور اکثر شہروں میں چاند نہیں دیکھا گیا ہے اس لئے علاقہ کے لوگ ان پانچ آدمیوں کو برا اور مجرم جانتے ہیں حالانکہ انہوں نے مسجد میں بیٹھ کر قسم اٹھائی ہے، شرعی فیصلہ تحریر فرمایا جائے۔

اس کا جواب قاسم العلوم کے نائب مفتی مولانا احمد جان صاحب نے دیا ہے اور مفتی قاسم العلوم مولانا عبد اللہ صاحب نے اس کی تصحیح کی ہے اور فتاویٰ مفتی محمود میں اس کی اشاعت ہوئی۔ جواب ملاحظہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں اگر ان پانچ گواہوں میں سے دو عادل گواہ تھے اور ان کی گواہی علاقہ کے ذمہ دار علماء نے محض اس بنا پر نہیں لی کہ دوسرے بڑے شہروں میں چاند نہیں دیکھا گیا اور عید نہیں کی گئی تو یہ کوئی وجہ صحیح نہیں ہے بلکہ از روئے فتویٰ ان پر لازم تھا کہ ان کی گواہی پر اعتبار کر کے عید منانے کا حکم کرتے۔ (فتاویٰ مفتی محمود ج ۳ ص ۴۲۱-۴۲۰)

شرعی شہادت قبول نہ کرنے والے تھوڑا سا فتاویٰ مفتی محمود کے اس خط کشیدہ عبارت کا ٹھنڈے دل سے سوچ کر مطالعہ کر لیں اور اپنے متعصبانہ رویہ پر بھی سوچ کر لیں۔ جبکہ جو لوگ اپنی مدعا کیلئے اسی فتاویٰ مفتی محمود کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، خیبر پختونخواہ میں وقت کے جید علماء کرام کی معتمد علیہ ذیلی کمیٹیوں کی حیثیت فتاویٰ مفتی محمود کے فتویٰ

سے اجاگر ہو گئی اور فتوے میں مندرج مرکزی کمیٹی پر عدمِ اعتماد کے فتوے سے موجودہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کا حشر بھی دیکھ لیا۔

ایک تحقیقی نوٹ

فقہی نقطہ نظر سے مطالعہ کی حد تک میرا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کسی دینی امور میں، ہتکِ رمضان میں منکرات کے مرتکبین کو شرعی سزا دینے کا نہ مجاز ہے اور نہ سزا دے سکتا ہے، تو برائے نام رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے ان کو شرعی قاضی کا درجہ دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔ نیز رؤیتِ ہلال کا مسئلہ قضاء کے بجائے شہادت سے متعلق ہے جس میں فقہاء کرام نے قضاء قاضی کیلئے گنجائش نہیں چھوڑی۔

(۴) مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اور ذیلی کمیٹیوں کی شہادت

مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اگر ذیلی کمیٹیوں کی شہادت علی الرؤیۃ قبول نہ کرے تو ذیلی کمیٹی سے ملحق اطراف و اکناف کیلئے یہ شہادت معتبر ہے یا نہیں؟

ابھی آپ فتاویٰ مفتی محمود کے حوالے سے پڑھ چکے کہ صورتِ مسئولہ میں ان پانچ گواہوں میں دو عادل گواہ تھے اور ان کی گواہی علاقہ کے ذمہ دار علماء نے محض اس بنا پر نہیں لی کہ دوسرے بڑے شہروں میں نہیں دیکھا اور عید نہیں کی گئی۔ تو یہ کوئی وجہ صحیح نہیں بلکہ ازروئے فتویٰ ان پر لازم تھا کہ ان کی گواہی پر اعتبار کر کے عید منانے کا حکم کرتے۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا اب بھی کوئی گرد باقی ہے کہ پانچ گواہوں میں سے دو عادل کی گواہی اتنی معتبر قرار دی گئی کہ دیگر ذمہ دار علماء کرام کا اس عادل گواہوں کی گواہی پر اعتبار نہ کرنا اور عید منانے کا حکم نہ کرنا صحیح نہیں قرار دیا، تو کیا خیبر پختونخواہ کے باشرع عادل آدھا درجن یا ایک درجن گواہوں کی گواہی کا اعتبار نہ کرنا مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے حق میں صحیح ہے؟ وللہ در القائل کیا خوب لکھا: مگر افسوس ہے کہ آج تک حکومت نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی میں اب تک معتمد علماء کو نہیں لیا گیا ہے۔ اس لئے علماء کرام حکومت کے فیصلے سے اختلافِ رائے رکھتے ہیں، اگر حکومت مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی میں معتمد علماء کرام کو لے لے اور وہ احکامِ شرع کے تحت ہلال کی شہادتیں لے کر فیصلہ کر لیں (الی آخرہ)۔

اور اس کے بعد والے فتوے میں لکھتے ہیں: مگر افسوس ہے کہ آج تک حکومتِ پاکستان نے معتبر علماء کی مرکزی ہلال کمیٹی قائم نہیں کی ہے اور نہ ہی شرعی اصول و ضوابط کی کما حقہ رعایت رکھی ہے، اس لئے علماء پاکستان سرکاری اعلان کو قطعی فیصلہ قرار نہیں دیتے۔ یہ حضرت اقدس مولانا عبد اللطیف صاحب ؒ معین مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان کا فتویٰ ہے شوال ۱۳۸۶ھ کا۔ اور اس فتویٰ کی تصحیح الجواب صحیح سے حضرت اقدس مفتی محمودؒ نے کی ہے۔

معلوم ہوا کہ صرف خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے نہیں بلکہ پورے پاکستان کے علماء سرکاری اعلان کو قطعی فیصلہ اس لئے قرار نہیں دیتے کہ مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی شرعی اصول وضوابط کی کماحقہ رعایت نہیں رکھتے۔ اس لئے ذیلی کمیٹیوں کے جید اور نامور علماء کرام شرعی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے شہادۃ علی الرؤیۃ اور شہادۃ علی الشہادۃ کے اصولوں پر عمل کر کے امضاء کر کے شہادت کو منتقل کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ معتمد علماء کے ہاں مرکزی کمیٹی کے ارکان پر اعتماد مجروح ہے اور ان کے فیصلہ کو قطعی فیصلہ قرار نہیں دیتے اس لئے رؤیتِ ہلال کے بارے میں معتبر علماء کرام کا فیصلہ عام مسلمانوں کیلئے موجبِ عمل ہوگا۔

رؤیتِ ہلال کے دو مسئلے اور بھی ہیں جن کا اس رسالہ میں موجود ہونا اشد ضروری ہے اس لئے کسی دوست کے مشورہ سے ان پر بھی بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مسئلہ نمبر ۱: اختلافِ مطالع کی بحث

حضرت اقدس علامہ ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے رسالہ ''الاتمام والاکمال فی رویۃ الہلال'' میں لکھا ہے کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں یا کسی ایک اسلامی ملک میں بیک وقت عید منانا یا رمضان المبارک کا شروع ہونا شرعاً ضروری نہیں ہے جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے زمانے میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ شام میں حضرت معاویہؓ اور دیگر صحابہ کرام نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا تھا لیکن مدینہ منورہ میں حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ کرام نے چونکہ اس تاریخ میں نہیں دیکھا تھا اس لئے ان کا روزہ ایک دن بعد شروع ہوا۔ اور بقول شیخ الہند (کما فی معارف السنن) اس فرق کا اثر مہینہ کے اختتام پر بھی پڑ رہا تھا یعنی مدینہ والوں کی عید بھی شام والوں سے ایک دن بعد بھی تھی کما فی سنن الترمذی ص ۱۴۸ ج ۱ ''باب ما جاء لکل اهل بلد رؤیتهم''۔ اس لئے اس تصور کو ختم کرنا چاہئے کہ تمام مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہئے، یہ شرعی تصور نہیں ہے، جیسے کہ نماز کے اوقات مختلف ممالک میں یا ایک ملک کے مختلف شہروں میں الگ ہوتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ بُعدِ مسافت اور دیگر اسباب کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح عید الاضحیٰ اور یومِ عرفہ سب ممالک میں یکساں تاریخ میں نہیں ہوا کرتے۔ ہم اپنے ملک کی تاریخ کے اعتبار سے یومِ عرفہ کا منتخب روزہ رکھتے ہیں اور دیگر ممالک کے مسلمان اپنی تاریخوں کے اعتبار سے رکھتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح عید الفطر اور یکم رمضان بھی شرعاً ایک دن ہونا ضروری نہیں۔ اور یہ غلط فہمی کہ (مسلمانوں کی عید یا روزہ ایک تاریخ میں ہونا چاہئے) اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ہم نے عید کو، رمضان کو، عام اقوام کی تہوار کی طرح ایک تہوار سمجھا ہے، جیسے عیسائیوں یا آتش پرستوں کے تہوار ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ تہوار نہیں ہیں بلکہ خصوصی عبادت کے اوقات ہیں، جیسے دیگر عبادات میں وقت یا وحدتِ تاریخ شرعاً ضروری نہیں تو یہاں بھی یہی حکم ہوگا (کما فی معارف السنن س ۳۴۰ ج ۵)۔

اس کے بعد حضرت علامہ ڈاکٹر شامزئی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس میں شبہ نہیں کہ اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے نہ ہونے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں معتبر ہے اور امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں معتبر نہیں ہے۔ یہ اختلاف اسی طرح شامی وغیرہ میں منقول ہے لیکن بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے پر ابن رشد نے اجماع نقل کیا ہے، جیسا کہ معارف السنن ص ۷ ۳۳ ج ۵ میں موجود ہے اور فقہاء احناف میں علامہ کاسانیؒ، صاحبِ بدائع اور علامہ زیلعیؒ شارح کنز کی رائے بھی یہی ہے۔ ملاحظہ ہو معارف السنن ص ۷ ۳۳ ج ۵ اور بدائع ص ۸۳ ج ۲۔ رد المحتار شرح در المختار میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ایک مہینہ کی مسافت پر مطلع بدل جاتا ہے اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق تین دن کا سفر ۴۸ میل بنتا ہے، جیسے کہ سفر کے مسائل میں فقہاء نے لکھا ہے تو اس حساب کے مطابق چار سو اسی میل کی مسافت پر مطلع تبدیل ہو گا۔ دوسرا قول یہ لکھا ہے کہ چوبیس فرسخ کے فاصلے پر مطلع بدل جاتا ہے (شامی کتاب الصوم ص ۳۹۳ ج ۲) اور معارف السنن میں لکھا ہے کہ ہر پانچ سو میل کی مسافت پر مطلع بدل جاتا ہے و حققوا وقوع الاختلاف فی المطلع بنحو خمسمأة میل (ص ۳۴۰ ج ۵)

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ ایک ہی ملک جو پانچ سو میل سے زائد مسافت پر واقع ہو اس میں مطلع مختلف ہو سکتا ہے۔

نوٹ: اپنے دور کے مفتی اعظم پاکستان کا فتویٰ یہ ہے کہ ہر پانچ سو میل کے بعد مطلع مختلف ہو سکتا ہے، تو پھر ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم پشاور اور کراچی کا مطلع ایک ہونے کی کوشش میں اپنی توانائی خرچ کریں۔

مسئلہ نمبر ۲: جمِ غفیر (گواہوں کی بڑی تعداد) کی بحث

جمع کثیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولم يقدر الجمع الكثير فى ظاهر الرواية بشىء عن ابى يوسف انه قدره بعدد القسامة خمسين رجلا و عن خلف بن ايوب خمس مائة ببلخ قليل وقيل ينبغى ان يكون من كل مسجد جماعة واحد او اثنان وعن محمد انه يفوض مقدار القلة والكثرة الى رأى الامام كذا فى البدائع وفى فتح القدير و الحق ما روى عن محمد و ابى يوسف ايضا ان العبرة لتواتر الخبر و مجيئه من كل جانب۔

ترجمہ: جمع کثیر کے بارے میں ظاہر الروایۃ میں کوئی تقدیر یا مقرر تعداد نہیں ہے، صاحبین میں سے دونوں کی رائے الگ الگ ہے، امام ابو یوسفؒ نے قسامۃ کے عدد کے مطابق ۵۰ آدمیوں کا اندازہ مقرر کیا ہے اور خلف بن ایوب کا کہنا ہے کہ بلخ میں ۵۰۰ آدمی کم ہیں وہ کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ہر ایک

مسجد سے ایک یا دو آدمیوں کی جماعت ہو، امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ قلت اور کثرت کی مقدار امامِ وقت کی رائے پر موقوف ہے، علامہ کمال الدین ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ حق وہ ہے جو امام محمدؒ سے مروی ہے اور اسی طرح امام ابو یوسفؒ کی رائے حق معلوم ہوتی ہے کہ خبر تواتر اور ہر طرف سے خبر آنا معتبر ہے۔

اب اسی بارے میں علامہ ابن نجیمؒ فتاویٰ ظہیریہ کی عبارت نقل کر کے فیصلہ فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

و فی الفتاوی الظهيرية وان كانت السماء مصحية لا تقبل شهادة الواحد فی ظاهر الرواية بل يشترط العدد واختلفوا فی تقديره وظاهره ان ظاهر الرواية لا يشترط الجمع العظيم وانما يشترط العدد وهو يصدق على اثنين فكان مرجح الرواية الحسن التی اخترناها آنفا (بحر ص ۱۹۶ ج۲)

چند سطر بعد لکھتے ہیں:

ثم اذا لم تقبل شهادة الوحد و احتيج الى زيادة العدد عن ابی حنيفة انه تقبل شهاد رجلين او رجل وامرأتين وعن ابی يوسف انه لاتقبل ما لم يشهد على ذالك جمع عظيم وذالك مقدر بعدد القسامة وعن خلف بن ايوب خمس مأة ببلخ قليل وعن ابی حفص الكبير انه شرط الوفا وعن محمد ما استكثره الحاكم فهو كثير وما استقله فهو قليل هذا اذا كان الذی شهد بذالك فی المصر اما اذا جاء من مكان اخر خارج المصر فانه تقبل شهادته اذا كان عدلا ثقة لانه يتيقن فی الرواية في الصحاری ما لم يتيقن فی الامصار لما فيها من كثرة الغبار وكذا اذا كان فی المصر فی موضع مرتفع وهلال الفطر اذا كانت السماء مضحية كهلال رمضان ۱ھ فهذا يدل على ترجيح رواية الحسن وان ظاهر الرواية اعتبار العدد لا الجمع الكثير لكن فرقه بين من كان بالمصر وخارجه وبين المكان المرتفع وغيره قول الطحاوی اما ظاهر الرواية فلا يقبل فيه خبر الواحد مطلقا كما فی غاية البيان و فتح القدير۔ (بحر ص ۲۶۹ ج ۲)

یعنی فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ اگر مطلع صاف ہو تو ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ ایک گواہ کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی بلکہ متعدّد گواہوں کی گواہی شرط ہے، اور گواہوں کی تعداد کے اندازے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ فتاویٰ ظہیریہ کی بات انتہاء کو پہنچ گئی۔

اب علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں کہ فتاویٰ ظہیریہ سے ظاہر مستفاد یہ ہے کہ ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ جمع عظیم شرط نہیں ہے بلکہ متعدّد گواہ شرط ہیں اور عدد دو گواہوں پر بھی صادق آتی ہے، پس یہ قول حسن بن زیاد کے قول کی مرجح ہے جو ہم نے ابھی اختیار کیا۔

اور اس کے کچھ بعد فتاویٰ ولوالجیہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: پس جب ایک گواہ کی گواہی قبول نہیں اور متعدّد گواہوں کی گواہی درکار ہے (تو اس میں ائمہ احناف کی رائیں مختلف ہیں)۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ سے منقول یہ ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول کی جائے گی۔

امام ابو یوسفؒ سے منقول یہ ہے کہ جب تک جمع عظیم گواہی نہ دے اور اس کے اندازے کا معیار قسامہ کی مقدار کے مطابق ہوگی (اس سے کم قبول نہیں کی جائے گی)۔

اور خلف بن ایوب سے منقول یہ ہے کہ بلخ میں (اور اس جیسے دوسرے شہروں میں) پانچ سو گواہ قلیل ہیں۔

اور ابو حفص کبیر نے تو ہزاروں گواہوں کی تعداد کو شرط قرار دیا ہے۔

امام محمدؒ سے منقول یہ ہے کہ قلیل اور کثیر کا معیار حاکمِ وقت کے حکم پر موقوف ہے، حاکمِ وقت جب حکم لگائے کہ یہ کثیر ہے تو یہ کثیر ہے اور جب وہ حکم لگائے کہ یہ قلیل ہے تو قلیل ہے۔ یہ حکم تب ہوگا جب جائے شہادت مصر ہو اور اگر کوئی گواہ خارج المصر سے دوسری جگہ سے آجائے پس جب گواہ ثقہ ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی کیونکہ صحراؤں میں رؤیت یقینی ہوتی ہے شہروں میں اتنی یقینی نہیں ہوتی اس لئے کہ شہر میں فضاء زیادہ گرد آلود ہوتی ہے اسی طرح اگر شہر ہی میں ہو لیکن گواہ اونچی جگہ پر ہو اور جب مطلع صاف ہو تو عید الفطر کی چاند رمضان کی چاند جیسا ہے۔ فتاوی ولوالجیہ کی عبارت مکمل ہوئی۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ فتاویٰ ظہیریہ اور فتاوی ولوالجیہ کی بات حسن بن زیاد کی بات کو ترجیح دینے پر دلالت کرتی ہے اور ظاہر الروایۃ جمع کثیر کی نہیں بلکہ متعدّد گواہوں کو معتبر قرار دیتی ہے لیکن فرق صرف مصر اور خارج مصر میں ہے اور اونچے مکان اور پست مکان میں ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے جمِ غفیر اور جمعِ کثیر کا فیصلہ کر دیا اور مسئلہ حل کر دیا اور دو معتبر فتاویٰ کی تائید حاصل کرتے ہوئے حسن بن زیادؒ کے قول کہ — متعدّد گواہ دو ہی ہیں — کو جمِ غفیر کا معیار قرار دے دیا۔ اور اس قول کا اعتبار کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کل اس قول پر عمل کرنا مناسب ہے کیونکہ لوگ (عوام الناس اور اسی طرح خواص) چاند دیکھنے میں سست ہو گئے ہیں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ”یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا“ کہ دین میں (ممکن حد تک) لوگوں کیلئے آسانی پیدا کیا کرو اور تنگی سے اجتناب کرو اور لوگوں کو دین سے متنفر کرنے کے بجائے (دین و دنیا کی بھلائیوں اور دین پر عمل کرنے کی جزاؤں کا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے صلہ کی) خوشخبریاں سنایا کرو۔ اور اسی طرح قرآن کریم کی ہدایات بھی یہی ہیں۔

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ان الله مع الصابرين۔ (پ ۵ سورۃ الانفال آیت نمبر ۴۵)

ترجمہ: آپس میں جھگڑا مت کرو پس تم پھسل جاؤ گے اور تمہاری ہوا نکل جائے گی (یعنی اسلامی دنیا میں تمہارا رعب اور وقار ختم ہو جائے گا جیسا کہ ماضی قریب میں ہمارے بہت سے دوستوں کا عوام میں حشر ہو گیا۔ اور اگر کوئی بضد ہو کر تم سے خواہ مخواہ جھگڑا کرنا چاہے تو تم جھگڑا کرنے کے بجائے) صبر کرو کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالی ہماری حفاظت فرما کر اپنی رضاء نصیب فرمائے۔ آمین۔ فقط واللہ اعلم۔

محض اللہ کی رضا کیلئے اپنی شرح صدر کے مطابق خیبر پختونخواہ میں عموماً اور لکی مروت میں خصوصاً انتشار اور خلفشار سے بچنے کی خاطر چند اوراق سیاہ کر دیے۔ امید ہے علماء کرام کا سنجیدہ طبقہ رسالہ "جرعۃ الزلال" پر سنجیدگی سے غور کر کے مسئلے کو خود سمجھیں گے اور دوسروں کو سمجھائیں گے اور عام مسلمانوں کو انتشار سے بچانے کی کوشش کریں گے اور انتشار کو ہوا دینے کی بجائے انتشار کی مدافعت کریں گے کیونکہ موجود وقت امت کی مزید انتشار کا متحمل نہیں اور بیرونی سازشوں کا متحمل نہیں افسوس خیبر پختونخواہ میں سالہا سالوں کا چلنے والا متفقہ مسئلہ کو اختلافات کا نذر کر دیا گیا۔ اللہ تعالی امتِ مسلمہ کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرماویں، آمین، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

انتشار پھیلانے والوں کی خدمت میں علامہ اقبال کی وصیت:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کیلئے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہے کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

مرکزی رُؤیتِ ہلال کمیٹی پر اعتراضات کا جواب

اویس حفیظ

(۳۱ مئی ۲۰۲۰ء کو humsub.com.pk پر شائع ہونے والی تحریر)

ویسے تو اس بار چاند کے معاملہ پر مفتی منیب بمقابلہ فواد چودھری کا ''ٹرینڈ'' زیر گردش رہا مگر معاملہ فواد چودھری تک محدود نہیں ہے۔ مفتی منیب الرحمٰن کا نجانے اس معاملے پر کس کس سے مقابلہ ہوتا ہے۔ کبھی یہ ٹرینڈ مفتی منیب بمقابلہ مفتی پوپلزئی ہو جاتا ہے، کبھی مفتی منیب بمقابلہ سلیم صافی، کبھی مفتی منیب بمقابلہ سوشل میڈیا، کبھی مفتی منیب بمقابلہ سائنس اور جانے کیا کیا۔ اگر بات مفتی منیب الرحمٰن سے شروع کی جائے تو مفتی منیب الرحمٰن کی ذات نہ صرف مسلکی، علاقائی وگروہی عصبیتوں سے پاک نظر آتی ہے بلکہ بارہا ایسے مواقع آئے جب تمام مسالک کی قیادت نے مفتی منیب الرحمٰن پر نہ صرف مکمل اعتماد کا اظہار کیا بلکہ ان کی تقرری بطور چیئرمین رویت ہلال کمیٹی کو بھی جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ اگر کوئی محض تعصب کا شکار ہو کر مفتی صاحب کی ذات پر کیچڑ اچھالے تو یہ اس کی تربیت کا شاخسانہ ہو سکتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔ اگر دین و شریعت اور رویت ہلال سے متعلق چند بنیادی اصولوں کا سرسری سے بھی مطالعہ کر لیا جائے تو علم ہو جاتا ہے کہ اس ساری لڑائی میں کون درست ہے اور کون غلط، کون شرعی اصولوں کی پاسداری کو مقدم رکھ رہا ہے اور کون اپنی خواہش نفس اور انا کی تسکین کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

سب سے پہلے بات کرتے ہیں رؤیتِ ہلال کمیٹی پر ہونے والے عمومی اعتراضات کی۔

ایک عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پچاس سال پرانی دوربین سے چاند کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اب یہاں دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ کیا جدید اور جدید ترین دوربین اس چاند کو بھی لا حاضر کرتی ہے جو پیدا ہی نہیں ہوا؟ یا جس کے نظر آنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں؟ دوم، اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ دوربین پچاس سال پرانی ہے (اگرچہ ایسا نہیں ہے) تو کیا پچاس سال پرانی چیز کام نہیں دے سکتی؟ دوربین خواہ سو سال پرانی ہو، اس کا کام دور کی چیز کو نزدیک کر کے دکھانا ہے۔ دوربین کے معاملے میں تاحال کوئی جدت نہیں ہوئی، ماسوائے یہ کہ کتنی دور کی چیز دکھا سکتی ہے۔ اگر

پچاس سال پہلے اس سے چاند دیکھا جا سکتا تھا، تو آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چاند کو ایک مخصوص سمت میں تلاش کیا جا رہا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ وہ فلک پہ کہیں اور موجود ہے۔ یہ نہایت بودا اعتراض ہے، چاند کے نظر آنے کے امکانات اور جگہ کا تعین متعلقہ محکموں کی طرف سے کیا جاتا ہے، اسی لیے دوربین کا رخ ایک مخصوص جگہ پر ہوتا ہے۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مفتی صاحبان خود چشمے لگا کر دور نزدیک کی چیزیں دیکھتے ہیں، وہ آسمان میں چاند کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟ ایسے اور اس قسم کے اعتراضات کو جس قدر چاہیں بڑھا لیں، ان پر کسی کی کبھی تشفی نہیں ہو سکتی۔

اب آتے ہیں مفتی منیب بمقابلہ مفتی پوپلزئی پر۔ اگر مفتی پوپلزئی کے دلائل کا جائزہ لیا جائے تو اس حد تک تو ان کی بات درست ہے کہ جب کوئی رؤیتِ ہلال کی شہادت آجاتی ہے تو شریعت یہی کہتی ہے کہ کم از کم ایک یا دو شہادتوں کو تسلیم کرتے ہوئے رمضان/عید کا اعلان کر دیا جائے۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ مفتی پوپلزئی کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ چاند دیکھیں، رمضان عید کا اعلان کریں، اور ریاست کے متوازی ادارہ قائم کریں؟ اگر کل کو کوئی شخص پشاور میں قاضی عدالت لگا کر بیٹھ گیا اور لوگوں کے فیصلے کرنے لگا تو کیا ریاست اسی طرح تماشا دیکھے گی جیسے ابھی دیکھ رہی ہے؟ یا یہ معاملہ صرف رؤیتِ ہلال کے لئے ہی مخصوص ہے؟ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ پیسوں کے لیے جھوٹی گواہیاں اور حلف دیتے ہوں، جو جھوٹ اور بددیانتی میں آخری حدود کو چھوتا ہو، وہاں ہر ایرے غیرے کی گواہی قبول کرنا چہ معنے دارد؟ وہ بھی ایسے حالات میں جب تمام تر سائنسی شواہد چاند کے پیدا نہ ہونے یا نظر نہ آنے پر متفق ہوں، خالی گواہی کو ماننا بھی درست نہیں بلکہ اس پر جرح کی جاتی ہے اور یہی کام مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کرتی ہے۔

یہاں اگر میڈیا ذرا سی ہوشیاری کا مظاہرہ کرے تو آن سکرین جھوٹ کا پردہ چاک کیا جا سکتا ہے۔ چاند دیکھنے کی شہادت دینے والوں تمام افراد کا انٹرویو ریکارڈ کیا جائے کہ انہوں نے چاند کس وقت اور کس جگہ دیکھا، پھر ان تمام بیانات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو علم ہو جائے گا کہ یہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ ہمارے یہاں اس حوالے سے ایک جھوٹ بڑا تواتر سے بولا جاتا ہے کہ میں نے غروبِ آفتاب کے فوری بعد چھت پر جا کر چاند دیکھا، درست وقت کوئی نہیں بتاتا، سب کا ایک ہی بیان ہوتا ہے کہ غروبِ آفتاب کے فوری بعد۔ ایسے میں بھی اگر سمت کا تعین ہو جائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

یہ واضح رہے کہ محکمہ موسمیات کے مطابق (انتیسویں رات) چاند اس وقت تک دکھائی نہیں دیتا جب تک کہ اس کی عمر غروبِ آفتاب کے وقت کم از کم 19 گھنٹے اور غروبِ شمس و غروبِ قمر کا درمیانی فرق کم از کم 40 منٹ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد بھی چاند کا زمین اور سورج دونوں سے مخصوص زاویے پر ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ مفتی شہاب الدین پوپلزئی کو تو اس وقت بھی جبکہ چاند پیدا ہی نہ ہوا تھا (22 مئی کو جب باقی پاکستان کا اٹھائیسواں روزہ تھا) صرف حیدر خیل سے ہی 9 شہادتیں مل گئیں جن کی تصدیق مفتی صاحب کی ”ذیلی کمیٹی“ کے پانچ علماء حضرات نے کی۔

وہ الگ بات کہ جب سعودی عرب نے روزے کا اعلان کر دیا تو مفتی پوپلزئی نے بھی ان تمام شہادتوں کو رد کرتے ہوئے چاند نظر نہ آنے کی بنیاد پر تیس روزے کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ (بروز) ہفتہ 18 اگست 2012ء کو میرانشاہ اور بعض دوسرے علاقوں میں ایسی ہی "شہادتوں" پر عید الفطر کی گئی تھی جبکہ اس دن سعودی عرب سمیت پورے ریجن میں روزہ تھا۔ مخصوص علاقے کے لوگوں کی شہادت رد کرنے کا جو اعتراض مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی اور مفتی منیب پر کیا جاتا ہے، وہی اعتراض مفتی پوپلزئی پر کیوں نہیں کیا گیا؟ یا مفتی منیب پر تنقید کوئی قومی شغل ہے کہ جس کا دل کرتا ہے کہ مفتی منیب الرحمٰن کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ تو ایسے کوڑھ ہوتے ہیں کہ اس معاملے میں واجبی سا علم بھی نہیں رکھتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر مفتی منیب پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔

جو لوگ رؤیت کے معاملے میں مفتی پوپلزئی کی اقتدا اختیار کرتے ہیں انہیں بھی علم ہونا چاہیے کہ "روزہ کا دن وہی ہے جس دن تم روزہ رکھو، افطار (عید کا) دن وہی ہے جس دن تم افطار کرو"۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کی روایت کے بعد فرماتے ہیں کہ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ روزہ اور عید کا معاملہ جماعت اور امت کی اکثریت (کے) ساتھ ہے۔ امام صنعانیؒ، امام ابن القیمؒ، امام ابوالحسن سندھیؒ، امام البانیؒ سمیت جمہور علماء کا یہی موقف ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے چاند دیکھتا ہے مگر امام اس کی گواہی کو رد کر دیتا ہے تو اس کے حق میں بھی یہ امور یعنی روزہ رکھنا، عید منانا اور قربانی کرنا ثابت نہ ہوں گے اور اس بارے میں جماعت کی اتباع ہی واجب ہو گی۔

اس ضمن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی تو حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے ان پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ منیٰ میں دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دورِ خلافت میں بھی دو ہی رکعت پڑھتے رہے اور اب وہ پوری نماز (چار رکعت) پڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو یہ پسند ہے کہ میری دو ہی رکعتیں جو اللہ کو مقبول ہو جائیں وہ چار رکعتوں سے بہتر ہیں۔" لیکن جب خود حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے نماز پڑھی تو چار رکعت ہی پڑھیں۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ ایک طرف آپ حضرت عثمانؓ پر اعتراض کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ خود بھی چار رکعت ہی پڑھ رہے ہیں؟ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا جواب تھا کہ "الخلاف شر" یعنی اختلاف بری چیز ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ دورِ عثمانی میں ابتدائی نو برس تک منیٰ میں قصر نماز ہی ادا کی جاتی رہی، البتہ دسویں برس حضرت عثمانؓ نے پوری نماز یعنی چار رکعات پڑھائیں۔ اور لوگوں کے استفسار پر فرمایا کہ میں نے مکہ میں نکاح کیا ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو کسی شہر میں نکاح کر لے وہ مقیم جیسی نماز پڑھے (مسند احمد)۔ اسی طرح ایک جگہ آتا ہے کہ آپؓ نے نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! سنت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ کے دونوں اصحاب (سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ) سے ثابت ہے۔ لیکن اس سال لوگوں کی وجہ سے رش ہوا ہے، (یعنی کافی تعداد میں نومسلم بھی نماز میں شریک ہیں) لہٰذا مجھے یہ خوف ہوا کہ یہ لوگ اسے (مستقلاً) ہی نہ اپنا لیں (یعنی اپنے گھروں میں بھی چار کے بجائے دو فرض پڑھنے نہ لگ جائیں)، اسی لیے میں نے چار رکعات پڑھائیں (السنن الکبریٰ للبیہقی)۔

جب ریاست نے کسی معاملے میں اہتمام کر رکھا ہو، جیسے چاند دیکھنے کا، تو اس میں بہر صورت ریاست کی اتباع ہی لازم و ملزوم ہے۔ جو لوگ "طاغوتی ریاست" کی اصطلاح سے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں، انہیں باقی معاملات میں بھی پھر "طاغوت" والا رویہ ہی روا رکھنا چاہیے۔

کچھ طبقات کا خیال ہے کہ ہمیں چاند کے معاملے میں سعودی عرب کی تقلید کرنی چاہیے حالانکہ حدیث شریف میں صریحاً یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر شہر (ملک) کی اپنی رؤیت ہوتی ہے۔

حضرت کریبؒ بیان کرتے ہیں: میں شام میں تھا تو اسی درمیان رمضان کا چاند نکل آیا، ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا۔ پھر میں مہینے (رمضان) کے آخر میں مدینہ آیا تو ابن عباسؓ نے مجھ سے وہاں کے حالات پوچھے، پھر انہوں نے چاند کا ذکر کیا اور کہا: تم لوگوں نے چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہم نے اسے جمعہ کی رات کو دیکھا تھا اور لوگوں نے روزے رکھے۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا: لیکن ہم نے اسے ہفتہ کی رات کو دیکھا، تو ہم برابر روزے سے رہیں گے یہاں تک کہ ہم تیس دن پورے کر لیں یا ہم 29 کا چاند دیکھ لیں۔ تو میں نے کہا: کیا آپ معاویہؓ کے چاند دیکھنے اور روزہ رکھنے پر اکتفا نہیں کریں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے (صحیح مسلم 2528، سنن ابی داود 2332، سنن النسائی 2113، مسند احمد)۔

اس حدیث کی تشریح میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کا اسی پر عمل ہے کہ ہر شہر والوں کے لیے ان کے خود چاند دیکھنے کا اعتبار ہو گا۔ موجودہ دور میں ایک رؤیت پر ایک ملک کے لوگوں کے اکتفا کا اجتہاد کیا گیا ہے۔ بعض لوگ رمضان/عید کے بعد چاند دیکھ کر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ چاند فلاں تاریخ کا تھا، یعنی رؤیتِ ہلال کمیٹی نے غلط عید کرائی یا غلط روزہ رکھوایا۔ تو عرض یہ ہے کہ حدیث سے رجوع کریں، ایسے تمام مسائل کا حل وہاں موجود ہے۔

ابو البختری بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب بطن نخلہ پہنچے (ایک مقام کا نام) تو سب نے چاند دیکھنا شروع کیا اور بعض نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کے سبب) اور بعض نے کہا دو رات کا ہے، پھر ہم سیدنا ابن عباسؓ سے ملے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا: فلاں فلاں رات۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا (صحیح مسلم 2529)۔

یہ حدیث امام مسلمؒ نے جس باب میں باندھی ہے، اس کا عنوان ہی یہ رکھا ہے کہ ”چاند کے چھوٹے بڑے ہونے کا اعتبار نہیں اور جب بادل ہوں تو تیس دن شمار کر لیا کرو“۔

اس حوالے سے گزشتہ برس مفتی طارق مسعود کا بھی ایک بیان سننے کو ملا تھا، اس میں بھی مفتی صاحب نے یہی بتایا کہ لوگ مجھے فون کر کے کہتے ہیں کہ ہلال تو اتنی دیر نظر ہی نہیں آتا، ہم اسے اتنی دیر سے دیکھ رہے ہیں، ہماری عید غلط کرا دی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں مفتی طارق مسعود کا بھی یہی جواب تھا کہ چاند کو انتیس کو نظر آنا تھا لیکن اگر وہ کسی وجہ سے نظر نہیں آسکا تو جو چاند تیس کی رات کو نظر آئے گا وہ پہلی کا نہیں بلکہ (اپنی پیدائش کے اعتبار سے) دوسری رات کا ہو گا۔ یہ کامن سینس کی بات ہے مگر لوگ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اب تو اس کی سائنسی توضیح بھی موجود ہے۔ امسال شوال کا چاند 22 مئی کو پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق رات 10 بج کر 39 منٹ پر پیدا ہوا۔ ہفتہ 23 مئی کی شام غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر پاکستان کے تمام علاقوں میں 20 گھنٹوں سے کچھ زائد تھی۔ ایسے چاند کا نظر آنا ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور ہوتا ہے۔ بہر حال اسے چند لوگوں نے دیکھا اور ایک مقام پر جمِ غفیر نے اسے دیکھا، جس کی بنیاد پر رؤیتِ ہلال کمیٹی نے عید کا اعلان کیا۔ لیکن اگر بالفرض یہ چاند دکھائی نہ دیتا تو جو چاند 24 مئی کی رات کو ہمیں دکھائی دیتا، اس کی عمر غروبِ آفتاب کے وقت پاکستان کے تمام شہروں میں 44 گھنٹوں سے بھی زائد ہو چکی ہوتی۔ پھر غروبِ شمس اور غروبِ قمر کا درمیانی فرق جو کم از کم 40 منٹ ہونا چاہیے وہ 95 سے 98 منٹ تک ہوتا اور چاند پورے ملک میں واضح طور پر دکھائی دیتا (ہوا بھی ایسا ہی) جس پر لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے کہ یہ دوسری تاریخ کا چاند ہے، حالانکہ مذہبی و سائنسی لحاظ سے وہ یکم ہی کا ہلال ہوتا۔ اسی کلیہ پر اگر مفتی پوپلزئی کو پرکھا جائے تو جو چاند انہیں 22 کو نظر نہیں آسکا، وہ 23 مئی کو پورے ملک کو نظر آنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا، 23 مئی کو بھی خال خال ہی چاند نظر آیا، جس سے علم ہوتا ہے کہ مسجد قاسم کی دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

باقی بچے فواد چوہدری صاحب، تو ہفتہ 23 مئی کو سب سے بڑے اردو اخبار ”جنگ“ میں بیک پیج پر خبر کی سرخی ہی یہ تھی: ”فواد چوہدری کا دعویٰ مسترد، عید پیر کو ہوگی۔ محکمہ موسمیات“۔ چونکہ چاند نظر آنے کے امکانات بہت محدود تھے، اسی وجہ سے محکمہ موسمیات سمیت متعلقہ اداروں کا خیال تھا کہ عید 25 مئی کو ہوگی۔ بہتر ہوتا اگر فواد چوہدری پہلے سے ٹویٹ کرنے کے بجائے جیوانی اور پسنی جا کر میڈیا کو چاند دکھاتے، چاند کی کوئی وڈیو، کوئی تصویر میڈیا میں جاری کرتے، آخر کو وہ ایک وفاقی وزیر ہیں، اتنے تو ان کے ریسورسز ہوں گے، اگر وہ یہ کچھ نہیں کر سکتے تو بہتر ہو گا کہ نت نئے شوشے چھوڑنے کے بجائے وہ سپارکو، محکمہ موسمیات، اور پاکستان نیوی کی طرح رؤیتِ ہلال کمیٹی کی معاونت کریں۔ ویسے شاید انہیں علم نہ ہو، ان کے محکمے کے چند افراد پہلے سے کمیٹی کی معاونت کا کام کر رہے ہیں۔ ویسے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جو ”رؤیت ایپ“ انہوں نے یا ان کی وزارت (نے) بنائی تھی، اس میں بھی 23 مئی کو چاند کے نظر آنے کا امکان نہیں بتایا جا رہا تھا۔

جو لوگ رؤیتِ ہلال کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا طعنہ مارتے ہیں، انہیں علم ہونا چاہیے کہ فلکیات میں مسلمانوں کا علم کسی کا محتاج نہیں رہا، عبد الرحمٰن الصوفی جیسے افراد کا کام ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی چمک رہا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قمری کلینڈر کس بنیاد پر بنایا جائے گا؟ کیونکہ عام طور پر دنیا میں نئے چاند کی رؤیت یا امکانِ رؤیت کے حوالے سے قمری ماہ کی 29 تاریخ کو تین ریجن ہوتے ہیں: ریجن اے: جس میں ہلال کی واضح رؤیت کا امکان ہوتا ہے۔ ریجن بی: جہاں صورتحال غیر یقینی ہوتی ہے۔ ریجن سی: جس میں ہلال کی رؤیت کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اگر حقیقی رؤیت کے امکان پر مبنی کوئی مستقل کیلنڈر بنایا جاتا ہے اور ہمارا ملک ریجن بی میں آتا ہوا تو یہ کیلنڈر ناکام ہو جائے گا۔ لیکن اگر حقیقی رؤیت کے امکان پر مبنی کیلنڈر نہیں بنایا جاتا تو یہ شریعت کے احکام کے منافی ہے جس میں نہ صرف چاند دیکھنے کا حکم دیا گیا بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس روزے رکھو، یعنی چاند کی پیدائش کے امکان پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ رہو۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی صرف یہ بتا سکتی ہے کہ 29 تاریخ کو ہمارا ملک کون سے ریجن میں آتا ہے، لیکن کوئی قطعی پیش گوئی رؤیت سے ہی ممکن ہے۔

https://www.humsub.com.pk/321557

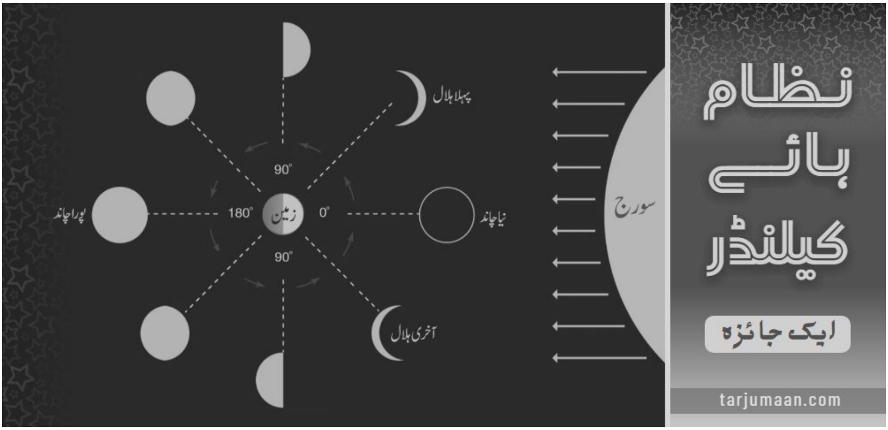

کیلنڈر ہزاروں سالوں سے انسانی تہذیب کا حصہ چلے آ رہے ہیں جو گزرنے والے وقت کا حساب رکھنے کے ساتھ ساتھ موسموں کی نشاندہی کرنے اور واقعات کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے زیر استعمال رہے ہیں۔ تاریخ میں مختلف ثقافتوں اور علاقوں میں سورج اور چاند کی نقل و حرکت کی بنیاد پر ایسے کیلنڈر بنائے گئے جن میں شمسی کیلنڈر، قمری کیلنڈر اور قمری شمسی کیلنڈر سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ کیلنڈر اس طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ آیا وقت کی پیمائش

١. زمین کے سورج کے گرد گھومنے کے حوالے سے کی جائے،
٢. چاند کے مختلف مراحل کی بنیاد پر کی جائے،
٣. یا پھر ان دونوں کے مجموعہ کو سامنے رکھتے ہوئے؟

مروّجہ کیلنڈروں پر ایک نظر

آئیے مختصراً کیلنڈر کے ان نظاموں کا طریقہ کار اور خصوصیات دیکھتے ہیں۔

شمسی کیلنڈر

شمسی کیلنڈر اس بنیاد پر بنایا گیا ہے کہ زمین کتنے عرصہ میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔ یہ عرصہ تقریبًا 365.24 دن ہے۔ اعشاریہ کے بعد جو اضافی حصہ ہے اسے ایڈجسٹ کرنے کے لیے ہر چار سال بعد فروری کے مہینے میں ایک اضافی دن شامل کیا جاتا ہے۔

اسی طرح زمین خود اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے جس سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں، کیونکہ زمین کا جو حصہ گھومتے ہوئے سورج کے سامنے آ جاتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور دوسرے حصہ میں رات ہوتی ہے۔

شمسی کیلنڈر کے ایک سال میں 365 دن اور لیپ سال میں 366 دن ہوتے ہیں۔ سال میں 12 مہینے ہوتے ہیں۔ ہر مہینے کے دنوں کی مخصوص تعداد مثلاً 30 یا 31 دن ہوتی ہے۔

گریگوریئن کیلنڈر (Gregorian Calendar) دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا شمسی کیلنڈر ہے جسے 1582ء میں پوپ گریگوری XIII نے پہلے سے چلے آنے والے جولین کیلنڈر (Julian Calendar) کو تبدیل کرنے کے لیے متعارف کرایا تھا۔ جولین کیلنڈر میں اگرچہ لیپ سال کا شمار موجود تھا لیکن بعض دیگر حوالوں سے اس میں درستگی کی ضرورت تھی۔

شمسی کیلنڈر اس حوالے سے اہم ہے کہ اس کی مدد سے موسموں کی درست طور پر نشاندہی کی جا سکتی ہے جس سے سال بھر کی مختلف سرگرمیوں کی منصوبہ بندی آسان ہو جاتی ہے خصوصاً زراعت کے نظام کے لیے یہ بہت اہم ہے۔

قمری کیلنڈر

قمری کیلنڈر چاند کے مراحل کی بنیاد پر طے پاتا ہے۔ ایک نئے چاند سے دوسرے نئے چاند تک تقریباً 29.5 دن ہوتے ہیں جو کہ ایک قمری مہینہ ہے۔ قمری کیلنڈر کا ایک سال تقریباً 354 دنوں پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ شمسی سال سے تقریباً 11 دن کم ہوتا ہے۔ چنانچہ قمری مہینے اپنا موسم تبدیل کرتے رہتے ہیں اور کسی خاص موسم کے ساتھ منسلک نہیں ہوتے۔

چاند کے مراحل کیا ہوتے ہیں؟ چاند زمین کے گرد چکر کاٹتا ہے اور یہ دونوں مل کر سورج کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ چنانچہ جیسے زمین پر سورج کی روشنی پڑتی ہے، اسی طرح چاند پر بھی سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ البتہ چاند کے جس رخ پر سورج کی روشنی پڑتی ہے وہ زاویہ مختلف ہونے کی وجہ سے زمین سے روزانہ مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً پہلا چاند جو ہلال کہلاتا ہے، وہ اُس رخ کا زمین سے سب سے کم نظر آنے والا حصہ ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد کے دنوں میں یہ روشنی والا حصہ بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ چودہ دنوں بعد زمین سے چاند کا وہ رخ مکمل نظر آتا ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد روزانہ روشنی کا یہ حصہ کم ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ مہینے کے آخر میں بالکل غائب ہو جاتا ہے یعنی زمین سے چاند کا روشنی والا رخ نظر نہیں آتا۔ یاد رہے کہ چاند کا مہینہ شروع ہوتے وقت اس پر سورج کی روشنی کا یہ حصہ دائیں طرف نظر آتا ہے، جبکہ درمیان مہینہ سے آخر مہینہ تک یہ چاند کے بائیں طرف ہوتا ہے۔

اسلامی کیلنڈر خالصتاً قمری کیلنڈر ہے جس میں ہر مہینے کا آغاز پہلے چاند یعنی ہلال کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، اور کیلنڈر کے سال میں 12 مہینے ہوتے ہیں۔ جبکہ قمری کیلنڈر کی ایک اور مثال عبرانی کیلنڈر بھی ہے جو روایتی طور پر خالصتاً قمری تھا لیکن بعد میں موسموں کی نشاندہی کے لیے اس میں ایڈجسٹمنٹ کر دی گئی، چنانچہ اب یہ قمری شمسی کیلنڈر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ایک خالص قمری کیلنڈر شمسی سال کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتا، جس کا مطلب یہ ہے کہ قمری مہینے موسموں میں

پیچھے کی طرف آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی کیلنڈر کا مہینہ رمضان وقت کے ساتھ مختلف موسموں میں آتا ہے کیونکہ قمری سال زمین کے سورج کے گرد گھومنے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

قمری شمسی کیلنڈر

ایسا کلینڈر جو قمری اور شمسی دونوں کیلنڈروں کی خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ اصل میں قمری کیلنڈر ہے جو چاند کے مراحل کی بنیاد پر طے پاتا ہے، جبکہ موسموں کی نشاندہی کے لیے اسے شمسی سال کے ساتھ بھی ہم آہنگ بنایا جاتا ہے۔ قمری شمسی کیلنڈر میں عام طور پر 12 مہینے اور لیپ سال میں 13 مہینے ہوتے ہیں۔ سال کی کل لمبائی شمسی کیلنڈر کی طرح تقریباً 365.24 دن ہوتی ہے لیکن مہینے چاند کے مراحل کی بنیاد پر طے کیے جاتے ہیں۔ 354 دن کے قمری سال اور 365 دن کے شمسی سال کے درمیان فرق کو پورا کرنے کے لیے ہر 2 سے 3 سال بعد ایک لیپ مہینہ شامل کیا جاتا ہے۔

روایتی چینی کیلنڈر ایک قمری شمسی کیلنڈر ہے جو نئے چینی سال جیسے تہواروں کی تاریخوں کے تعین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً ہر تین سال بعد ایک لیپ مہینہ شامل کیا جاتا ہے۔

عبرانی کیلنڈر میں قمری مہینے اور شمسی سال دونوں شامل ہیں جو اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ اس کی تاریخیں زرعی موسموں اور مذہبی رسومات کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔

ہندو کیلنڈر بھی قمری شمسی کیلنڈر ہے جو مذہبی تہواروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی مختلف علاقائی شکلیں ہیں۔

مختصراً یہ کہ شمسی کیلنڈر زمین کے سورج کے گرد چکر پورا کرنے پر طے پاتا ہے اور موسموں کی نشاندہی کے لیے بہترین ہے۔ قمری کیلنڈر صرف چاند کے مراحل پر طے پاتا ہے جس کے مہینوں کے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ قمری شمسی کیلنڈر چاند کے مراحل اور سورج کے سال دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے طے پاتا ہے۔ ہر کیلنڈر کوئی خاص مقصد پورا کرتا ہے۔ مثلاً شمسی کیلنڈر سالانہ سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ قمری کیلنڈر تاریخی طور پر مذہبی تہواروں اور رسومات کے حوالے سے اہم رہے ہیں۔ اور قمری شمسی کیلنڈر ان دونوں خصوصیات کو یکجا کرنے کا مقصد پورا کرتے ہیں۔

اسلامی ہجری کیلنڈر

اسلامی کیلنڈر خالصتاً قمری ہے اور اسے ہجری کیلنڈر بھی کہا جاتا ہے۔ وقت کی پیمائش کا یہ نظام زمین کے سورج کے گرد گھومنے کے بجائے چاند کے مراحل پر مبنی ہے۔ یہ کیلنڈر اسلامی روایت میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور بنیادی طور پر عبادات، تاریخی واقعات اور تعطیلات و رسومات کا تعین کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

آغاز اور تاریخ

اسلامی کیلنڈر کا آغاز 622 عیسوی میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ ہجرت سے ہوتا ہے۔ یہ واقعہ اتنا اہم ہے کہ اسلامی تاریخ کے نقطہ آغاز کا باعث بن گیا ہے۔ ہجرت کے سال کو 1 ہجری کہا جاتا ہے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ نے 638 عیسوی میں اسلامی ہجری کیلنڈر قائم کیا تا کہ اسلامی واقعات کی تاریخوں کو ریکارڈ میں لایا جا سکے۔

اسلام کے ظہور سے پہلے جزیرہ نما عرب میں مختلف قسم کے قمری اور قمری شمسی کیلنڈر استعمال ہوتے تھے۔ شمسی کیلنڈر زمین کے سورج کے گرد چکر مکمل کرنے کی بنیاد پر طے پاتا ہے، قمری کیلنڈر چاند کے مراحل کی بنیاد پر طے پاتا ہے، جبکہ قمری شمسی کیلنڈر اس طرح طے پاتا ہے کہ قمری کیلنڈر میں اضافی مہینوں کا اندراج کر کے اسے شمسی کیلنڈر سے ہم آہنگ بنایا جاتا ہے۔ اسلامی کیلنڈر نے ان اضافی مہینوں کا اندراج ترک کر کے خالصتاً قمری کیلنڈر اپنایا۔

ساخت اور خصوصیات

اسلامی کیلنڈر چونکہ خالصتاً قمری ہے جو کہ چاند کے مراحل پر مبنی ہے اس لیے اس میں سورج کے گرد زمین کی گردش کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اسلامی سال 12 قمری مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چاند کو زمین کے گرد چکر پورا کرنے پر تقریباً 29.5 دن لگتے ہیں جو کہ ایک قمری مہینہ ہے۔ ایک قمری سال تقریباً 354 یا 355 دن طویل ہوتا ہے جو کہ شمسی سال سے تقریباً 11 دن چھوٹا ہوتا ہے۔

اسلامی کیلنڈر کا سال ان مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے: محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ ان میں سے ہر مہینہ 29 یا 30 دن کا ہوتا ہے جو کہ چاند کے زمین کے گرد چکر پر منحصر ہے۔

ہر قمری مہینے کا آغاز نیا چاند یعنی ہلال دیکھنے سے ہوتا ہے، جسے اصطلاحاً رؤیتِ ہلال کہتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات و روایات کی رو سے اس کے لیے آسمان میں اصل چاند کا مشاہدہ ضروری ہے۔ اگرچہ مختلف تنظیمیں اور ادارے قمری کیلنڈر کی تشکیل کے لیے فلکیاتی حساب کتاب کی جدید ٹیکنالوجیز بھی استعمال کرتے ہیں۔

اسلام میں اہمیت اور موجودہ استعمال

قمری کیلنڈر اسلامی عبادات اور مذہبی تہواروں کے حوالے سے مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ ثقافتی اور روحانی اہمیت رکھتا ہے، مثلاً:

رمضان جو کہ روزہ اور عبادات کا مہینہ ہے، اس کا آغاز ہلال کے نظر آنے سے ہوتا ہے، یہ مہینہ 29 یا 30 دن تک جاری رہتا ہے، جس کا اختتام شوال کا ہلال نظر آنے پر ہوتا ہے اور یکم شوال عید الفطر کا دن ہے۔ اس مہینے کے دوران صبح

سے شام تک روزہ رکھنا اسلام کے پانچ ستونوں (بُنی الاسلام) میں سے ایک ہے۔

حج جو کہ مکہ مکرمہ میں ذوالحجہ کے مہینے میں ہوتا ہے، یہ بھی اسلام کے پانچ ستونوں میں سے ایک ہے اور جسمانی اور مالی طور پر استطاعت رکھنے والے ہر مسلمان پر فرض ہے۔ عید الاضحیٰ کا اسلامی تہوار بھی اسی مہینہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو قربان کرنے کی رضامندی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

محرم کا مہینہ متعدّد وجوہات کی بنا پر اہم ہے۔ یکم محرم جو کہ اسلامی سال کا پہلا دن ہے اسے شمسی سال کی طرح جشن کے ساتھ تو نہیں منایا جاتا البتہ یہ اسلامی تاریخ خصوصاً پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورہ کا دن اسلامی تاریخ کے مختلف واقعات کی نشاندہی کرتا ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی اور دنیا بھر کے مسلمان اس حوالے سے مختلف طریقوں سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

اگرچہ موجودہ دور میں تقریباً تمام مسلم ممالک انتظامی اور روزمرہ کے کاموں کے لیے شمسی کیلنڈر استعمال کرتے ہیں، البتہ بعض ممالک میں قمری کیلنڈر کی تاریخوں کا اندراج بھی سرکاری دستاویزات پر کیا جاتا ہے۔ سعودی عرب کا سرکاری کیلنڈر قمری ہے، جبکہ دیگر مسلم ممالک میں بھی قمری کیلنڈر مذہبی مقاصد کے لیے سرکاری نظام میں استعمال کیا جاتا ہے۔

قمری کیلنڈر عالمی سطح پر روزمرہ زندگی کے لیے استعمال نہیں ہوتا لیکن یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مذہبی عبادات و رسومات کے تعین کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ اسی کی رو سے اسلامی تعطیلات، روزہ اور حج وغیرہ کی تاریخوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

شمسی اور قمری کیلنڈر میں فرق

بنیادی فرق یہ ہے کہ شمسی کیلنڈر کے سال کا دورانیہ 365.24 دن ہے جس میں زمین سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرتی ہے۔ اس کے برعکس قمری کیلنڈر چاند کے مراحل پر مبنی ہے جس کا سال شمسی سال سے تقریباً 11 دن چھوٹا ہوتا ہے۔

شمسی کیلنڈر عالمی سطح پر زیادہ تر غیر مذہبی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے زراعت، کاروبار، حکومتی اور بین الاقوامی معاملات وغیرہ۔ جبکہ قمری کیلنڈر بنیادی طور پر مذہبی تہواروں اور عبادات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

چونکہ قمری سال چھوٹا ہوتا ہے اس لیے خاص اسلامی دن جیسے آغازِ رمضان، عید الفطر اور عید الاضحیٰ وغیرہ شمسی کیلنڈر میں ہر سال تقریباً 10-12 دن پہلے آتے ہیں، یعنی یہ دن سالوں کے دوران مختلف موسموں میں منائے جاتے ہیں۔

فلکیاتی حسابات کی بحث

اگرچہ قمری کیلنڈر ایک پائیدار نظام ہے جو 1400 سال سے زائد عرصہ سے روایتی طریقے سے استعمال ہو رہا ہے،

البتہ جدید دور میں فلکیات اور ٹیکنالوجی میں ترقی نے قمری مہینے کے آغاز کا تعین کرنے کے نئے طریقے وضع کیے ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ایک بحث یہ ہے کہ آیا فلکیاتی حساب کتاب کی بنیاد پر قمری مہینوں کے آغاز کو معیار مانا جائے؟ تاکہ اس سے ان اختلافات کا سدباب کیا جا سکے جو رؤیتِ ہلال یعنی چاند کو دیکھ کر مہینے کا آغاز کرنے کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ تقریبًا ہر سال ایسا ہوتا ہے کہ اسلامی مہینوں کا آغاز مختلف ممالک میں ایک دن کو نہیں ہو پاتا۔ بہرحال اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر رؤیتِ ہلال پر زور دیتا ہے کہ چاند دیکھ کر مہینے کا آغاز کیا جائے کیونکہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ایسا کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اور اگر مسلم ممالک کی کوئی متفقہ مرکزی اتھارٹی ایسی طے ہو جائے جو نئے چاند کا اعلان کرے تو یہ مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے۔

https://tarjumaan.com

(567) وصیة لأزواجھم کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ کی تفسیر میں مشہور رائے یہ ہے کہ یہاں شوہر کی طرف سے وصیت مراد ہے یعنی شوہر کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کردے۔ اس کے علاوہ مفسرین نے مجاہد کی رائے ذکر کی ہے کہ یہاں اللہ کی طرف سے وصیت مراد ہے۔ شوہر وصیت کرے یا نہ کرے، بیوہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سال شوہر کے چھوڑے ہوئے گھر میں رہے اور شوہر کے اولیا اس کا خرچ ادا کریں۔ درج ذیل ترجمے مشہور تفسیر کے مطابق ہیں:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ۔ (البقرۃ: 240)

”اور جو لوگ تم میں مرجاویں اور چھوڑ جاویں عورتیں وصیت کردیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک نہ نکال دینا“۔ (شاہ عبدالقادر)

”تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان ونفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں“۔ (سید مودودی)

”اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں، وہ اپنی عورتوں کے لیے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی بے نکالے“۔ (احمد رضا خان)

”اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں“۔ (فتح محمد جالندھری)

”جو لوگ تم میں سے فوت ہوجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ وصیت کر جائیں کہ ان کی بیویاں سال بھر تک فائدہ اٹھائیں انہیں کوئی نہ نکالے“۔ (محمد جوناگڑھی)

سید قطب اور شیخ ابوزہرہ وغیرہ نے مجاہد کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے بھی یہی تھی، وہ ترجمہ کرتے ہیں:

”تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑی ہوں، اُن کی بیویوں کے بارے میں وصیت کی جاتی ہے کہ ایک سال تک ان کو نان ونفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں“۔

اس ترجمے کی رو سے شوہر وصیت کرے یا نہ کرے اللہ کی طرف سے بیوہ عورت کو ایک سال کی رہائش مع نان نفقہ کا یہ حق حاصل ہے۔ قرآن میں اللہ کے ساتھ وصیت کا لفظ آیا ہے، جیسے: وَصِيَّةً مِنَ اللّٰهِ (النساء: 12) اور: يُوصِيكُمُ اللّٰهُ (النساء: 11)۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہر شوہر کو یہ موقع حاصل نہیں ہوتا ہے کہ وہ مرتے وقت وصیت کر سکے۔ اللہ تعالی نے اس حکم کو جس اہتمام اور تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا تقاضا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے حکم الہی سمجھ کر بہر حال عمل پذیر ہونا چاہیے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے کئی احکام جن کی قرآن مجید میں بڑی تاکید آئی ہے، مسلمانوں کی زندگی میں وہ بالکل نظر نہیں آتے۔ ان میں سے ایک حکم یہ بھی ہے۔

(568) وأن تعفوا کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں بعض مترجمین نے وَأَنْ تَعْفُوا کا مخاطب مردوں کو قرار دیا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے اسی آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں کی طرف سے معاف کرنے کی بات آئی ہے۔ درست بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کی طرف سے معاف کرنے کے ذکر کے بعد یہاں تمام اہل اسلام (مرد و عورت) کو معاف کرنے کی فضیلت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى۔ (البقرة: 237)

”اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے“۔ (احمد رضا خان)

”اور تم مرد درگزر کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے“۔ (شاہ عبدالقادر)

”اور اگر تم مرد لوگ اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے“۔ (فتح محمد جالندھری)

”اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو، تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے“۔ (سید مودودی)

درج ذیل ترجمہ درست ہے:

”تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے“۔ (محمد جوناگڑھی)

(569) ولا تنسوا الفضل بینکم کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں فضل سے مراد کیا ہے؟

عربی میں فضل کا مطلب فضیلت یعنی بڑائی اور بزرگی بھی ہوتا ہے اور فضل کا مطلب احسان وکرم بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں فضل دونوں معنوں میں آیا ہے لیکن بڑی کثرت کے ساتھ احسان وکرم کے معنی میں آیا ہے۔ درج ذیل آیت میں (ہمارے علم کی حد تک) تمام مفسرین نے فضل سے احسان وکرم مراد لیا ہے، لیکن نہ جانے کیسے بعض مترجمین نے فضل کا ترجمہ بڑائی اور بزرگی کر دیا۔ یہاں یہ ترجمہ بے محل معلوم ہوتا ہے۔ سیاق کلام ایک دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے، نرمی برتنے اور فراخ دلی سے کام لینے کا ہے، نہ کہ اپنی یا دوسرے کی فضیلت کو یاد کرنے کا۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔ (البقرۃ:237)

”اور نہ بھلا دو بڑائی رکھنے آپس میں“۔ (شاہ عبدالقادر)

”اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو“۔ (محمد جوناگڑھی)

”اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو“۔ (امین احسن اصلاحی)

درج ذیل ترجمے مناسب معلوم ہوتے ہیں:

”آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو“۔ (سید مودودی)

”اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بُھلا نہ دو“۔ (احمد رضا خان)

”اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا“۔ (فتح محمد جالندھری)

جس طرح وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى کا مخاطب مرد وعورت سبھی ہیں، اسی طرح وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ کا مخاطب بھی مرد وعورت سبھی ہیں۔

(570) استبشر کا مطلب

عربی لغت کے ماہرین کے مطابق استبشر کا مطلب ہے خوش ہونا۔ لسان العرب میں ہے: اسْتَبْشَر: فَرِحَ۔

استبشر باب استفعال سے ہے، لیکن باب استفعال میں ہمیشہ طلب کا مفہوم نہیں ہوتا۔ بلکہ فعل میں زور پیدا کرنا بھی اس باب کی ایک خاصیت ہے۔ قاضی ابن عطیۃ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: يَسْتَبْشِرُونَ معناه:

يسرون ويفرحون، وليست استفعل فى ہذا الموضع بمعنى طلب البشارة، بل ہى بمعنى استغنى اللّٰہ واستمجد المرخ والعفار۔ (المحرر الوجیز)

قرآن مجید میں یہ لفظ متعدّد جگہوں پر آیا ہے۔ سبھی جگہوں پر اس کا ترجمہ خوش ہونا اور خوشی منانا کیا گیا ہے۔ البتہ صاحب تدبر نے تین جگہوں پر اس کا ترجمہ ”بشارت حاصل کرنا“ کیا ہے:

فَرِحِينَ بِمَا آتَاہُمُ اللَّہُ مِنْ فَضْلِہِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِہِمْ مِنْ خَلْفِہِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْہِمْ وَلَا ہُمْ يَحْزَنُونَ۔ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّہِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّہَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ۔ (آل عمران: 170، 171)

”فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اَخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا“۔ (امین احسن اصلاحی)

”جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے اس میں خوش ہیں۔ اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے اور (شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں کہ (قیامت کے دن) ان کو بھی نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔ اور اس سے کہ خدا مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا“۔ (فتح محمد جالندھری)

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْہُمْ إِيمَانًا وَہُمْ يَسْتَبْشِرُونَ۔ (التوبۃ: 124)

”وہ جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں“۔ (امین احسن اصلاحی)

”سو جو ایمان والے ہیں ان کا ایمان تو زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں“۔ (فتح محمد جالندھری)

جب کہ دیگر مقامات پر انھوں نے اس لفظ کا ترجمہ خوش ہونا کیا ہے۔

فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِہِ۔ (التوبۃ: 111)

”سو تم اس سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے خوشی مناؤ“۔ (امین احسن اصلاحی)

وَجَاءَ أَہْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ۔ (الحجر: 67)

”اور شہر والے خوش خوش آ پہنچے“۔ (امین احسن اصلاحی)

فَإِذَا أَصَابَ بِہِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِہِ إِذَا ہُمْ يَسْتَبْشِرُونَ۔ (الروم: 48)

"پس جب وہ اس کو نازل کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے تو وہ یکایک خوش ہو جاتے ہیں"۔ (امین احسن اصلاحی)

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ۔ (عبس:39)

"ہشاش بشاش!"۔ (امین احسن اصلاحی)

قرآنی استعمالات اور ماہرین لغت کی تصریحات کی روشنی میں راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ تمام مقامات پر استبشر کا ترجمہ خوش ہونا کیا جائے۔

(571) رءوف کا ترجمہ

درج ذیل ترجمے میں رَءُوفٌ کا ترجمہ 'نہایت خیر خواہ' لغت کے مطابق نہیں ہے۔

وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران:30)

"اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے"۔ (سید مودودی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

"اور خدا اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے"۔ (فتح محمد جالندھری)

دیگر مقامات پر صاحب تفہیم نے بھی یہی ترجمہ کیا۔

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ۔ (لبقرة:143)

"یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق ورحیم ہے"۔ (سید مودودی)

"خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحبِ رحمت ہے"۔ (فتح محمد جالندھری)

(572) القصص الحق کا ترجمہ

قَصَص (قاف پر زبر) ہو تو اس کا معنی قصہ گوئی خبر گوئی بھی ہوتا ہے اور خود قصہ یا خبر کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ جب کہ قِصَص (قاف کے نیچے زیر) قصة کی جمع ہے یعنی قصے اور خبریں۔

لسان العرب میں وضاحت ہے: والقِصّة: الْخَبَرُ وَہُوَ الْقَصَصُ۔ وَقَصَّ عَلَيَّ خبَره يقُصُّه قَصّاً وقَصَصاً: أَوْرَدَه۔ والقَصَصُ: الخبرُ المَقْصوص، بِالْفَتْحِ، وُضِعَ مَوْضِعَ الْمَصْدَرِ حَتَّى صَارَ أَغْلَبَ عَلَيْهِ۔ والقِصَص، بِكَسْرِ الْقَافِ: جَمْعُ القِصّة الَّتِي تُكْتَبُ۔

درج ذیل آیت میں یا تو ترجمہ ہو گا صحیح قصہ یا صحیح بیان واقعہ۔ جمع کے صیغے میں "صحیح واقعات" ترجمہ کرنا درست نہیں ہو گا۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ۔ (آل عمران:62)

"یہ سب حقیقی واقعات ہیں"۔(ذیشان جوادی)

"یہ تمام بیانات صحیح ہیں"۔(فتح محمد جالندھری)

"یہ بالکل صحیح واقعات ہیں"۔(سید مودودی)

درج بالا تینوں ترجموں میں یہ کم زوری موجود ہے، جب کہ ذیل کے ترجمے مناسب ہیں:

"بیشک یہی سچا بیان ہے"۔(امین احسن اصلاحی)

"یہی بیشک سچا بیان ہے"۔(احمد رضا خان)

"یہ بالکل صحیح بیان واقعہ ہے"۔(امانت اللہ اصلاحی)

(573) اشتروا الکفر بالإیمان کا ترجمہ

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ۔ (آل عمران:177)

"بیشک جنھوں نے ایمان سے کفر کو بدلا"۔(امین احسن اصلاحی)

درج بالا ترجمے میں کم زوری ہے۔یہاں کفر کو ایمان سے بدلنے کی بات نہیں ہے۔بلکہ ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرنے کی بات ہے۔

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

"جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں"۔(سید مودودی)

(574) ببعض ما کسبوا کا ترجمہ

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا۔ (آل عمران: 155)

"تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے"۔(سید مودودی)

درج بالا ترجمے میں کسبوا کا ترجمہ "کمزوریوں" کیا گیا ہے۔یہ درست نہیں ہے۔کم زوری کے لیے کسب کا لفظ نہیں آئے گا۔درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

"بیشک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں انہیں شیطان ہی نے لغزش دی ان کے بعض اعمال کے باعث"۔(احمد رضا خان)

(575) سنن کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں سنن کے مختلف ترجمے کیے گئے ہیں:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ۔ (آل عمران:137)

”تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں“۔(فتح محمد جالندھری)

”تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں“۔(امین احسن اصلاحی)

”تم سے پہلے کچھ طریقے برتاؤ میں آچکے ہیں“۔(احمد رضا خان)

”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں“۔(سید مودودی)

آخر الذکر ترجمے میں سنن کا ترجمہ ”دور“ کیا گیا ہے۔ لغت کی رو سے اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

(576) إصرا کما حملتہ کا ترجمہ:

درج ذیل آیت میں یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ وہ خاص بوجھ جو پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا وہ ہم پر نہ ڈال۔ بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ پہلے کے لوگوں نے تو بوجھ اٹھائے تھے مگر ہمارے اوپر کوئی بوجھ نہ ڈال۔ درج ذیل ترجمے ملاحظہ ہوں:

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا۔ (البقرة:286)

”ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے“۔(سید مودودی)

”ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا“۔(محمد جوناگڑھی)

درج بالا ترجموں سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی خاص بوجھ کو نہ ڈالنے کی دعا کی جارہی ہے۔

”اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا“۔(فتح محمد جالندھری)

”خدایا ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا پہلے والی امتوں پر ڈالا گیا ہے“۔(ذیشان جوادی)

”ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا“۔(محمد حسین نجفی)

درج بالا تینوں ترجموں میں بھی خاص نوعیت والے بوجھ کا مفہوم نکلتا ہے۔

درج ذیل ترجمہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

”اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا“۔(احمد رضا خان)

مولانا امانت اللہ اصلاحی ترجمہ کرتے ہیں:

”ہم پر اس طرح بوجھ نہ ڈال، جس طرح تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا“۔

درج ذیل ترجمے میں اصر کا ترجمہ حکم کیا گیا ہے۔ اصر کی تفسیر میں تو یہ بات کہی جاسکتی ہے لیکن اصر کا ترجمہ حکم کرنا درست نہیں ہے۔

’’ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے‘‘۔ (اشرف علی تھانوی)

(577) إلی أجلہ کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں إِلَىٰ أَجَلِهِ کا ترجمہ کرنے میں لوگوں کو دشواری پیش آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ إِلَىٰ کا مشہور معنی ’’تک‘‘ ہے لیکن یہاں اس معنی سے بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ البتہ إلی معیت کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس جملے میں وہ معنی لینے سے مفہوم بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔ کچھ ترجمے ملاحظہ ہوں:

وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ۔ (البقرۃ:282)

’’اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو یا بڑا اس کے وعدے تک‘‘۔ (شاہ عبدالقادر)

’’اور اسے بھاری نہ جانو کہ دین چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت کرلو‘‘۔ (احمد رضا خان)

’’اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اس (کی دستاویز) کے لکھنے میں کاہلی نہ کرنا‘‘۔ (فتح محمد جالندھری، إِلَىٰ أَجَلِهِ کا ترجمہ چھوٹ گیا۔)

’’اور خبردار لکھا پڑھی سے ناگواری کا اظہار نہ کرنا چاہے قرض چھوٹا ہو یا بڑا مدت معین ہونی چاہیے‘‘۔ (ذیشان جوادی)

’’اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا جس کی میعاد مقرر ہے۔ اس کے لکھنے میں سہل انگیزی نہ کرو‘‘۔ (محمد حسین نجفی)

’’اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو‘‘۔ (محمد جوناگڑھی)

موخر الذکر تینوں ترجموں میں إِلَىٰ أَجَلِهِ کا ترجمہ اصل الفاظ کے مطابق نہیں ہے۔ ’’مدت متعیّن ہونی چاہیے یا ’’مدت مقرر ہے‘‘، الفاظ سے آزاد ترجمہ ہے۔

إِلَىٰ أَجَلِهِ کا درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

’’معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو‘‘۔ (سید مودودی)

یعنی قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اسے اس کی طے شدہ مدت ادائیگی کے ساتھ لکھو، تاکہ بعد میں کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔ قرض کے نظام کو منضبط کرنے کے لیے یہ بہت اہم ہدایت ہے۔ امت میں اس قرآنی حکم کے سلسلے میں بھی عام تساہل اور لاپرواہی نظر آتی ہے۔

(578) سنة ولا نوم کا ترجمہ

سِنَۃٌ کا ترجمہ اونگھ اور نَوْمٌ کا ترجمہ نیند ہے۔ ترجمے کو اسی ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن بعض مترجمین سے تسامح ہوا اور ترتیب الٹ گئی۔ نیچے درج ترجمے دیکھیں:

لَا تَأْخُذُہُ سِنَۃٌ وَلَا نَوْمٌ۔ (البقرۃ:255)

"وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے"۔ (سید مودودی)

"اسے نہ نیند آتی ہے نہ اُونگھ"۔ (ذیشان جوادی)

درج ذیل ترتیب درست ہے:

"اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند"۔ (احمد رضا خان)

باجماعت نماز

قرآن و سنت کی روشنی میں

مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی

اسلام ایک جامع دین ہے، جو نہ صرف انسان کی انفرادی اصلاح کرتا ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے بھی بہترین اصول وضع کرتا ہے۔ اس میں عبادات کو نہ صرف انفرادی ذمہ داری کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ انہیں اجتماعی طور پر ادا کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ نماز، جو دین کا ستون ہے، اگر باجماعت ادا کی جائے تو اس کے روحانی، اجتماعی اور اخلاقی اثرات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

باجماعت نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ صرف فرض نمازوں کی بہترین ادائیگی قرار دیا بلکہ اس کے ذریعے گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کی بھی خوش خبری دی۔ احادیثِ مبارکہ میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ باجماعت نماز میں شریک ہونے والے شخص کے پچھلے گناہوں کی بخشش کی جاتی ہے اور اس کا مقام اللہ کے نزدیک بلند کر دیا جاتا ہے۔ یہ عبادت نہ صرف گناہوں کا کفارہ بنتی ہے بلکہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد، محبت اور بھائی چارے کو بھی مضبوط کرتی ہے۔

باجماعت نماز کی اہمیت

قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالی نے اور سینکڑوں احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور پابندی کے ساتھ نمازِ باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز میں کوتاہی اور سستی کرنے والوں کو منافقین کی صف میں شمار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:

> ”نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ تعالی کے لئے با ادب کھڑے رہا کرو۔“ (سورۃ البقرۃ:۲۳۸)

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالی ہے:

"اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔' (سورۃ البقرۃ: ۴۳)

یہ آیات نمازِ باجماعت ادا کرنے کی فرضیت پر واضح اور صریح دلائل ہیں۔ اگر مقصود صرف نماز قائم کرنا ہی ہوتا تو آیت کے آخر میں "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو" کے الفاظ نہ ہوتے، جو نمازِ باجماعت ادا کرنے کی فرضیت پر واضح نص ہیں۔

میدانِ جنگ میں باجماعت نماز

اللہ تعالیٰ نے میدانِ جنگ میں بھی نمازِ باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حالتِ امن میں بالاولیٰ نمازِ باجماعت فرض ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"جب تم ان میں ہو اور ان کے لئے نماز کھڑی کرو تو چاہیئے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لئے کھڑی ہو پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آجائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آجائے اور تمہارے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔" (سورۃ النساء: ۱۰۲)

اگر کسی کو نمازِ باجماعت نہ ادا کرنے کی اجازت ہوتی تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ ان مجاہدین کو اجازت دیتے جو میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے صفیں بنائے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میرا ارادہ ہوا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں، پھر نماز کے لیے اذان دینے کا، پھر کسی سے کہوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور میں اس کے بجائے ان لوگوں کے پاس جاؤں (جو جماعت میں شریک نہیں ہوتے) اور انہیں ان کے گھروں سمیت جلا دوں۔ (بخاری: ۲۴۲۰، مسلم: ۶۵۱)

نابینا شخص اور باجماعت نماز

نابینا شخص کے لیے بھی جماعت سے غیر حاضری کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: "اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں کیڑے مکوڑے (سانپ بچھو وغیرہ) اور درندے بہت ہیں، (تو کیا میں گھر میں نماز پڑھ لیا کروں)؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "کیا تم حی علی الصلاۃ، اور حی علی الفلاح کی آواز سنتے ہو؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں، (سنتا ہوں)"۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر تو مسجد آ"۔ اور آپؐ نے انہیں جماعت سے غیر حاضر رہنے کی اجازت نہیں دی۔ (صححہ الالبانی فی صحیح النسائی: ۸۵۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم نے ایسے وقت بھی دیکھے ہیں جب صرف وہی شخص نماز سے پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معلوم ہوتا یا بیمار ہو۔ اور (بسا اوقات) بیمار بھی دو آدمیوں کے سہارے سے چل کر آجاتا یہاں تک کہ نماز میں شامل ہو جاتا۔“ انہوں نے مزید کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت کے طریقوں کی تعلیم دی اور ہدایت کے طریقوں میں سے ایسی مسجد میں نماز پڑھنا بھی ہے جس میں اذان دی جاتی ہو۔“ (صحیح مسلم: ۱۴۸۷)

لہٰذا کسی مسلمان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ نماز جیسے عظیم الشان اور اہم ترین فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی یا سستی کرے۔

نمازِ باجماعت گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان پر بہت بڑا احسان کیا کہ انسان سے سرزد ہونے والے گناہوں کی معافی کے لیے ایسے نیک اعمال کی ترغیب دلائی ہے کہ جس کے کرنے سے انسان کے زندگی بھر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لئے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کے حصول کے ذرائع اور اسباب اختیار کرنا نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ اصل محروم تو وہی ہے جو ایمان اور اللہ کی مغفرت و رحمت سے محروم رہ گیا۔ اور جو گناہوں کی مغفرت اور برائیوں کے کفارے کے اسباب اپنانے سے محروم رہا وہ بھی محروم ہے۔

درج ذیل سطور میں باجماعت نماز اور گناہوں کی مغفرت کے عنوان پر چند احادیث پیش کی جا رہی ہیں تاکہ مسلمانوں کو باجماعت نماز ادا کرنے میں رغبت و دلچسپی ہو اور باجماعت نماز میں کوتاہی کرنے والوں کو تنبیہ ہو۔

(۱) وضو اور نماز کی تیاری

وضو کر کے نماز کی تیاری کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے وضو کیا اور خوب اچھی طرح وضو کیا، تو اس کے جسم سے اس کے گناہ خارج ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔“ (صحیح مسلم: ۵۷۸)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے:

”جو شخص بھی اچھی طرح وضو کرے، پھر نماز پڑھے، تو اس کے اس نماز سے لے کر دوسری نماز پڑھنے تک کے دوران ہونے والے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (صحیح مسلم: ۲۲۷)

(۲) باجماعت نماز کا اہتمام کرنا

جماعت کے ساتھ نماز کی پابندی کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں حد (سزا) کا مرتکب ہو گیا ہوں، مجھ پر حد قائم فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا بھلا تو نے آتے وقت وضو کیا تھا؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں!'' آپؐ نے فرمایا: ''کیا تو نے ہمارے ساتھ مل کر نماز پڑھی ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاؤ اللہ نے تجھے معاف کر دیا ہے۔'' (صحیح مسلم: ۲۷۶۵)

(۳) باجماعت نماز کی نیت بھی باعثِ ثواب

باجماعت نماز کی نیت بھی باعثِ ثواب ہے۔ یعنی کوئی شخص جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی نیت کے ساتھ مسجد آیا لیکن پھر بھی جماعت نہ مل سکی تو اس کی نیت اور کوشش کی وجہ سے اسے جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب ملے گا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا، پھر مسجد کی طرف چلا تو دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہیں تو اسے بھی اللہ تعالیٰ جماعت میں شریک ہونے والوں کی طرح ثواب دے گا، اس سے جماعت سے نماز ادا کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' (صححہ الالبانی فی صحیح النسائی: ۸۵۴)

(۴) خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرنا

نماز کو خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کوئی بھی مسلمان فرض نماز کا وقت پائے پھر وہ اس کے لیے اچھی طرح وضو کرے، اچھی طرح خشوع سے اسے ادا کرے اور احسن انداز سے رکوع کرے، تو وہ نماز اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوگی جب تک وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور یہ عمل ہمیشہ کے لیے ہے۔'' (صحیح مسلم: ۲۲۸)

(۵) باجماعت نماز کے لئے چل کر جانا

باجماعت نماز کے لیے چل کر جانے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''جس نے نماز کے لیے وضو کیا اور وضو کی تکمیل کی، پھر فرض نماز کے لیے چل کر گیا اور لوگوں کے ساتھ یا جماعت کے ساتھ نماز ادا کی یا مسجد میں نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔''

(صحیح مسلم: ۲۳۲)

(۶) مسجد سے واپسی بھی کارِ ثواب

جس طرح باجماعت نماز کے لئے مسجد کی طرف چل کر جانا باعثِ مغفرت و کارِ ثواب ہے اسی طرح مسجد سے واپسی بھی باعثِ مغفرت اور کارِ ثواب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص جماعت کی نماز کے لیے مسجد جاتا ہے، اس کا ایک قدم اس کا گناہ مٹاتا ہے اور دوسرا قدم اس کے لیے نیکی لکھتا ہے، یہ اجر مسجد جاتے اور مسجد سے واپس آتے دونوں وقت حاصل ہوتا ہے۔

(حسنہ الالبانی فی صحیح الترغیب: ۲۹۹)

یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کی وسعت کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس (شخص) نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی لیکن چونکہ وہ شخص جماعت کے ساتھ نماز کی نیت سے چل کر مسجد آیا تھا تو اس کے لیے جماعت کے برابر اجر ملے گا۔ ایک مسلمان نمازی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے۔ (بخاری: ۷۷۴، مسلم: ۶۴۹)

(۷) مسجد میں باجماعت نماز کا انتظار

مسجد میں باجماعت نماز کے لئے انتظار کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ کیونکہ زیادہ دیر بیٹھنے اور انتظار کے دوران فرشتے انتظار کرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا گھر کے اندر یا بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا ثواب زیادہ ملتا ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص وضو کرے اور اس کے آداب کا لحاظ رکھے پھر مسجد میں صرف نماز کی غرض سے آئے تو اس کے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ ایک درجہ اس کا بلند کرتا ہے اور ایک گناہ اس سے معاف کرتا ہے۔ اس طرح وہ مسجد کے اندر آئے گا، مسجد میں آنے کے بعد جب تک نماز کے انتظار میں رہے گا اسے نماز ہی کی حالت میں شمار کیا جائے گا۔ اور جب تک اس جگہ بیٹھا رہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہے تو فرشتے اس کے لیے رحمتِ خداوندی کی دعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس کو بخش دے، اے اللہ! اس پر رحم کر۔ (فرشتے دعا کرتے رہتے ہیں) جب تک وہ بے وضو نہ ہو جائے۔“

(بخاری: ۶۵۱، مسلم: ۶۶۲)

اجر و ثواب کے لحاظ سے سب سے بڑا انسان

باجماعت نماز ادا کرنے والا اجر و ثواب کے لحاظ سے سب سے بڑا انسان ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”نماز میں ثواب کے لحاظ سے سب سے بڑا وہ شخص ہوتا ہے جو (مسجد میں نماز کے لیے) زیادہ سے زیادہ دور سے آئے۔ اور جو شخص نماز کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے اور پھر امام کے ساتھ پڑھتا ہے اس شخص سے اجر میں بڑھ کر ہے جو (پہلے ہی) پڑھ کر سو جائے۔“ (بخاری: ۶۵۱، مسلم: ۶۶۲)

(۸) امام کے پیچھے آمین کہنا

نمازِ جہری میں امام کے پیچھے آمین کہنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب امام ”غیر المغضوب علیهم ولا الضالین“ کہے تو تم ”آمین“ کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے ساتھ ہو جائے اس کی تمام پچھلی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔“ (الترغیب والترہیب، کتاب الصلوٰۃ، ج:۱، ص:۱۳۰)

(۹) رکوع سے اٹھنے کے بعد اللّٰھم ربنا لک الحمد کہنا

رکوع سے اٹھنے کے بعد امام کے ساتھ ذکر میں شریک ہونے کی وجہ سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب امام ”سمع الله لمن حمده“ کہے تو تم ”اللهم ربنا ولك الحمد“ کہو۔ کیونکہ جس کا یہ کہنا فرشتوں کے کہنے کے ساتھ ہوگا، اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔“ (صححہ الالبانی فی صحیح الترمذی: ۲۶۷)

(۱۰) نماز میں پہلی اور دوسری صف میں کھڑا ہونا

نمازِ باجماعت میں پہلی اور دوسری صف میں کھڑے ہونے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے پہلی صف والوں کے لیے تین بار اور دوسری صف والوں کے لیے ایک بار مغفرت طلب کرتے تھے۔“ (صححہ الالبانی فی صحیح ابن ماجہ: ۸۲۲)

جب ایک مومن مسلمان کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بخشش طلب کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بخش دیتے ہیں۔ لہٰذا پہلی صف میں کھڑا ہونا چاہیے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری صف میں کھڑا ہو کر بخشش کا مستحق بننا چاہئے کیونکہ پہلی صف کی فضیلت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"بیشک اللہ تعالیٰ پہلی صف والوں پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے اس کے حق میں دعا کرتے ہیں۔" (صححہ الالبانی فی صحیح ابن ماجہ: ۹۹۷)

(۱۱) تشہد میں مغفرت طلب کرنا

تشہد میں دعائے مغفرت مانگنے سے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ حضرت محجن بن ادرع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک شخص (کو دیکھ کر) جس کی نماز ختم ہونے کے قریب تھی اور وہ تشہد میں یہ دعا کر رہا تھا:

"اے اللہ! بے شک میں آپ سے سوال کرتا ہوں، اے اللہ! تو ایک ہے، تو بے نیاز ہے، تو وہ ذات ہے جس نے نہ کسی کو جنا اور نہ ہی وہ جنا گیا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ (یہ کہ) تو میرے گناہوں کو معاف کر دے، بے شک تو بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔"

محجن بن ادرع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

"اس کو بخش دیا گیا، اس کو بخش دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔" (صححہ الالبانی فی صحیح النسائی: ۱۳۰۰)

قارئین کرام! درج بالا احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو مسلمان اپنے گھر میں اکیلا نماز پڑھتا ہے، اس نے جماعت چھوڑ کر کس عظیم فضیلت سے خود کو محروم کر دیا ہے۔ اور نمازِ باجماعت کے ذریعے جو گناہوں کی مغفرت نصیب ہوتی ہے، اس سے وہ کس قدر دور ہے۔ وہ یہ بھی سوچے کہ یہ عبادت روزانہ پانچ مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔ ہر نماز میں ان فضائل کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کیونکہ وہ پانچ بار مسجد جاتا ہے اور سترہ رکعات پڑھتا ہے۔ تو ہفتے، مہینے اور سال میں کتنی رکعات بن جائیں گی؟ ہر رکعت میں امام کے ساتھ سورۃ الفاتحہ اور رکوع کے بعد ذکر میں شامل ہو کر اس کے لیے مغفرت کا ایک نادر موقع موجود ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فرشتوں کی دعاؤں کا بھی مستحق بن سکتا ہے اور اس طرح اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مسلسل ایسی حالت میں رہے تو ممکن ہے کہ جب وہ اللہ سے ملے تو گناہوں سے پاک ہو۔

اس طرح مسلمان کے لیے مؤذن کے الفاظ "حی علی الفلاح" (آؤ کامیابی کی طرف) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل فرمان کا بھی مطلب سمجھ آتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بھلا بتاؤ تو سہی، اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس نہر میں ہر دن پانچ بار نہائے تو کیا اس کے جسم پر کچھ بھی میل کچیل رہے گا؟ صحابہؓ نے کہا: اس کے جسم پر تھوڑی بھی میل نہیں رہے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی مثال ہے پانچوں نمازوں کی، ان نمازوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“ (بخاری: ۵۲۸، مسلم: ۶۶۷)

بہت افسوس کی بات ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان جماعت کی نماز سے غافل رہتے ہیں اور اس عظیم اجر کو ضائع کرتے ہیں۔ در حقیقت بغیر کسی عذر کے جماعت کی نماز چھوڑنا ایک گناہ ہے۔ بغیر عذرِ شرعی با جماعت نماز نہ پڑھنے کو منافقت کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”جس گاؤں یا بستی میں تین آدمی ہوں اور جماعت نہ قائم کریں تو شیطان ان پر مسلط ہو جاتا ہے، لہٰذا جماعت کو ضروری سمجھو کیونکہ بھیڑیا بچھڑی ہوئی بکری کو کھاتا ہے۔“ (حسنہ الالبانی فی صحیح ابی داؤد: ۵۴۱)

قارئین کرام! احادیثِ مبارکہ سے نمازِ باجماعت کی اہمیت اور فوائد معلوم ہو گئے، لہٰذا ہمیں با جماعت نماز سے غائب اور پیچھے رہنے سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے پانچ وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ مساجد میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنے بچوں اور جن لوگوں کی ذمہ داری ہم پر ہے، ان کی بھی اس بارے میں تربیت کرنی چاہیے، کیونکہ ہم ان کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔

نیز اللہ پاک کا پیارا بننے کے لئے، درجات کی بلندی کو پانے کے لئے، جنت میں داخلے کے لئے، جہنم سے آزادی کے لئے، منافقت سے نجات پانے کے لئے، شیطان سے حفاظت کے لئے، اور اسی طرح اللہ پاک کی رحمت، مغفرت اور بہت سے فوائد حاصل کرنے کے لئے، نمازِ باجماعت کی پابندی کیجئے اور دوسروں کو بھی نیکی کی دعوت دے کر باجماعت نماز پڑھنے کی ترغیب دلایئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو نمازِ باجماعت کا پابند بنائے اور ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے نیک اعمال کو قبول فرمائے، آمین یارب العالمین۔

تمہید

علامہ شوق نیموی عالم اسلام کے معروف عالم دین ہیں، ان کی کتاب آثار السنن فقہ حنفی کا مستند مرجع ہے، وہ عظیم آباد کے دبستان علم و ادب کے باکمال اور قابل فخر فرزند اور ہندوستان کے سرمایۂ ناز محقق ہیں۔ ایک زمانہ تک ان کی شخصیت پر گمنامی کا پردہ پڑا رہا، اگرچہ اس دوران ان پر ایک اہم کام سامنے آیا لیکن اس کے علاوہ ان کے علمی کاموں کی طرف وہ توجہ نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں، لیکن اب ان کے علمی و ادبی دونوں پہلوؤں پر اہل علم متوجہ ہوئے ہیں، ایک طرف پٹنہ میں ان کی ادبی خدمات پر کئی کاوشیں منظر عام پر آئی ہیں، وہیں ملکی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی ان کی طرف توجہ ہوئی ہے، ان کی کتاب آثار السنن عالم عربی میں اہتمام سے شائع ہوئی ہے، پاکستان میں اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں، ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا۔ ان کے تمام رسائل کا مجموعہ بھی پاکستان سے شائع ہوا ہے۔

مآخذ سوانح

علامہ شوق نے اپنی خود نوشت سوانح خود اپنے اہل وطن کے تذکرہ کے ضمن میں اپنی کتاب یادگارِ وطن میں تفصیل سے لکھی ہے، لیکن اس سے بھی قبل ان کے ایک شاگرد جناب بشیر صاحب ساکن پکا کوٹ ضلع بلیا [یوپی، انڈیا] نے ان کے حالات پر تذکرۃ الشوق کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا تھا جس میں ان کے ابتدائی حالات اور شاعری کا اجمالی تذکرہ ہے، اس کا ذکر خود حضرت شوق نے اپنے شاگردوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب بشیر کے حال میں کیا ہے، ان کے نام پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"رسالہ تذکرۃ الشوق جو سرمۂ تحقیق کے ساتھ چھپا ہے انہیں کی تالیفات سے ہے"۔[1]

یہ کتاب سرمۂ تحقیق کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے۔[2] جس کا سرورق یہ ہے:

”تذکرۃ الشوق موسوم بہ اسم تاریخی ظہیر المحاسن، ۱۳۰۵ھ، رقم زدہ کلک فصاحت سلک جناب منشی محمد بشیر صاحب ساکن پکا کوٹ ضلع بلیا“۔

کتاب کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے:

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ... حقیر فقیر محمد بشیر پکا کوٹی شاگرد فاضل جلیل عالم نبیل، شاعر نازک خیال، محقق بے مثال، لوذعی والمعی جناب مولانا ظہیر احسن صاحب شوق نیموی دامت برکاتہم جناب ممدوح کا کچھ حال قلمبند کرتا ہے، کہ لوگوں کو بخوبی آپ کے حالات سے اطلاع ہو جائے، اور آئندہ تذکرہ لکھنے والوں کو آسانی ہو... آپ کے پدر بزرگوار جناب شیخ سبحان علی صاحب ادخلہ اللہ فرادیس الجنان وافاض علیہ شآبیب الرحمۃ والغفران نیمی پرگنہ غیاث پور متعلقہ تھانہ فتوحہ ضلع عظیم آباد کے رہنے والے صدیقی النسب وسنی المذہب تھے، ۱۲۹۱ھ ہجری ۲۶ ماہ ذی الحجہ روز پنج شنبہ قریب غروب آفتاب اس جہان فانی سے رحلت فرما ہوئے“۔

اس کے بعد حضرت شوق کی ولادت اور تعلیم کا ذکر ہے، اور تقریبًا وہی باتیں ہیں جو خود حضرت شوق نے اپنی خود نوشت میں لکھی ہیں، اور ان کی تصانیف پر جو تقریظات لکھی ہیں ان سب کا تذکرہ ہے، اور اخیر میں ان کے چند اشعار اور ان کی مختصر تشریح ہے، یہ چند ورقی رسالہ آج کل کے مضمون کی طرح ہے۔

اس کے بعد حضرت شوق نے خود اپنے مفصل حالات لکھے جو ان کی کتاب یادگار وطن میں شامل ہے۔ اور الفبائی ترتیب کے مطابق لفظ ظ کے ذیل میں ہے۔ بعد میں ان کے فرزند مولانا عبد الرشید فوقانی نیموی نے مختلف رسائل و مجلات میں ان پر مضمون لکھا، اور تذکار الشوق اور القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن میں بھی ان کے حالات لکھے، تذکار الشوق [3] میں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ بشیر صاحب کی کتاب پر استدراک ہے، بعد میں اسی کو انہوں نے مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری کی تنقیدی کتاب ابکار المنن فی تنقید آثار السنن کے جواب میں لکھی ہوئی اپنی کتاب القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن کے اخیر میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خدا بخش میں خود مصنف کی تحریر میں موجود ہے، جو شاید مسودہ کتاب ہے، دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ مباحث تو القول الحسن کے اخیر میں شائع ہوئے تھے لیکن مزید مباحث اس میں رہ گئے تھے۔ میرے خیال میں یہ کتاب الگ سے شائع نہیں ہوئی ہے، البتہ اس کا خلاصہ مختلف اخبار و رسائل ہفتہ وار نقیب، پھلواری شریف اور پندرہ روزہ ہماری آواز، علی گڑھ میں شائع ہو چکا ہے۔ علامہ نیموی کے سوانح نگار مولانا ڈاکٹر عتیق الرحمٰن عظیم آبادی (ت ۲۲ جمادی الاولی ۱۴۴۶ھ) نے اپنی سوانح میں جا بجا اسی مضمون کا حوالہ دیا ہے۔

یہ مذکورہ بالا کتابیں ان کی سوانح کے اصل مآخذ ہیں، کچھ جزوی اطلاعات عظیم آباد کے دیگر تذکروں میں بھی ملتی ہیں، جن سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے، ان کتابوں کو پیش نظر رکھ کر مولانا ڈاکٹر عتیق الرحمٰن نے اپنی کتاب علامہ شوق نیموی حیات و خدمات لکھی، اور لوگوں نے دیگر کتابوں میں ان کے حالات پیش کیے۔

وطن وخاندان

مضافات عظیم آباد کا ایک قریہ نیمی (ضلع پٹنہ تحصیل دنیاواں) حضرت شوق کا آبائی وطن ہے، ان کا تعلق یہاں کے صدیقی النسب خانوادہ سے تھا، جس کی تفصیل اور شجرۂ نسب ان کی سوانح میں موجود ہے۔ [4]

حضرت نیموی نے اپنے صدیقی النسب ہونے کی ایک شہادت بھی اپنے سفرنامۂ بنگال میں ذکر کی ہے، لکھتے ہیں:

"یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ شیوخ صدیقی بعد غاری کے خاندان میں چند پشت کے بعد کسی شخص کے دہنے پاؤں کے انگوٹھے میں سیاہ تل ضرور ہوتا ہے، اور اس سانپ کے کاٹنے کا داغ نمایاں ہوجاتا ہے، راقم الحروف بھی اسی خاندان سے ہے، حسنِ اتفاق سے فقیر کے داہنے پاؤں کے انگوٹھے میں ایک سیاہ تل داغ نما موجود ہے، مگر چوں کہ یہ کوئی کتابی بات نہیں لہذا یہ امر چنداں قابل اعتبار ولائق وثوق نہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے خاندان والے کے انگوٹھے میں بھی حسنِ اتفاق سے تل کا وجود ہو"۔ [5]

انہیں کے ہم نسب (وغالباً ہم جد بھی) مشہور محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی بھی علامہ نیموی کے قریب الوطن ہیں، اور دونوں ایک ہی وقت میں اپنے اپنے وطن میں اہل حدیث اور حنفی نقطۂ نظر کے مطابق علمِ حدیث کی خدمت میں مشغول تھے۔ حضرت شوق مسلک اہلِ حدیث کے سلسلہ میں سختی و شدت کے باوجود علامہ شمس الحق عظیم آبادی سے احترام و محبت کا تعلق رکھتے تھے، ایک جگہ انہوں نے یادگار وطن میں برادری کی بستیوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ڈیانواں، جو نیمی سے دکھن مائل بغرب تین کوس کے فاصلے پر ہے، یہاں جناب مولوی گوہر علی مرحوم ایک نامی رئیس گذرے ہیں، جن کی جود و سخاوت کا ڈنکا بجتا ہے، اھل الخیرات (۱۲۷۸ھ) تاریخ وفات ہے، ان کے صاحبزادے جناب مولوی محمد احسن مرحوم بھی اپنے پدر بزرگوار کے ہم قدم تھے، ان کے نواسے جناب مولوی شمس الحق صاحب بھی اسی بستی میں رہتے ہیں، جن کی تالیفات سے دینیات میں بعض رسائل چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، حال میں ان کی التعلیق المغنی علی الدارقطنی بھی چھپی ہے، آج کل ابوداود کی شرح غایت المقصود نام لکھ رہے ہیں"۔ [6]

حضرت شوق کے والدین کا ذکر خود ان کی تحریر میں ملتا ہے، ان کے شاگرد منشی بشیر نے بھی ان کا ذکر کیا ہے جو اوپر گذر چکا ہے، نیز اپنے حالات کے آغاز میں بھی اپنے والد کا ذکر کیا ہے، اور حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق حرف سین کے ذیل میں بھی ان کے حالات لکھے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں۔

"حضرت والدی جناب شیخ سبحان علی صدیقی مرحوم

۱۲۲۱ھ میں نیمی میں پیدا ہوئے، صاف ضمیر تاریخ ولادت ہے، جب جوان ہوئے، جناب مولانا مولوی محمد فصیح غازی پوری مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کی، کتابوں سے اس قدر شوق تھا کہ کچھ تو خود لکھیں اور اکثر دوسرے سے لکھوائیں، شاہنامہ فردوسی جلد سوم، دیوان حافظ، قصہ حاتم طائی اردو، دیوان جوشش وغیرہ کتابیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئیں [کذا] اب تک میرے کتب خانہ میں یادگار ہیں۔ جناب مولانا مولوی محمد ابراہیم نگرنہسوی مرحوم سے ان کو نہایت ہی ربط و اتحاد تھا، جناب مولانا موصوف دل سے ان کو مانتے تھے، اور نہایت قدر کے ساتھ پیش آتے تھے، چونکہ اکثر علماء کی صحبت بابرکت اٹھائی تھی، علم وفضل کی فضیلت اس قدر دل پر نقش تھی کہ ہمیشہ ان کی یہی آرزو رہی کہ میرے فرزندوں میں سے کوئی عالم ہوتا، جناب مرحوم کے دو محل تھے، محل اول سے اخی مولوی حکیم محمد نذیر احسن صاحب اور منشی ظہور احسن صاحب اور دوسرے محل سے دو لڑکیاں اور میں اور میرے چھوٹے بھائی محمد فرید حسن پیدا ہوئے، جناب والد مرحوم نے اپنے بڑے بیٹے جناب مولوی محمد نذیر احسن صاحب کی تعلیم میں بہت کوشش کی، قریب فضیلت کے پہنچ چکے تھے کہ بھائی صاحب دنیا کے بکھیڑوں میں پھنس گئے، پھر جناب مرحوم نے میری تعلیم میں کوشش کی، اللہ کی عنایت سے بہت جلد فارسی کی ضروری کتابیں پڑھ کے عربی پڑھنے لگا، میرے انداز کو دیکھ کر ہونہار سمجھ کے نہایت خوش ہوئے، ۱۲۹۶ھ میں یکایک مرض لقوہ میں مبتلا ہوئے، لاکھ علاج کیا گیا کچھ سود مند نہ ہوا، دو ایک روز بیمار رہے، آخر ذی الحجہ کی چھبیسویں تاریخ پنج شنبہ کے دن قبل مغرب رحلت فرمائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور شب جمعہ کو ملک الاولیا حضرت بخش شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی بغل میں پچھم جانب میری والدہ مرحومہ کی قبر کے سرہانے مدفون کئے گئے۔ جناب مرحوم پچھتر (۷۵) برس اس عالم فانی میں رہے، غسل کے وقت روشن چہرہ، ہنستی پیشانی نظر آتے تھے، بعد وفات جناب مرحوم طرح طرح کے الجھاؤ ہوئے جو مانع تحصیل علوم تھے، مگر میں ان کی دلی آرزو کو خیال کر کے ہمہ تن تکمیل علوم میں مشغول رہا۔ جب اللہ تعالی جل شانہ کی عنایات سے ۱۳۰۴ھ میں کل علوم عربیہ درسیہ سے فارغ التحصیل ہو کر میں لکھنؤ سے مع الخیر نیمی پہنچا تو اسی ہفتے میں جناب مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ نہایت سفید کپڑے پہنے ہوئے حج کر کے تشریف لاتے ہیں، اور بے شمار کتابیں ان کے ساتھ ہیں، جب میں ملا تو ارشاد فرمایا کہ یہ کتابیں عرب سے تمہارے لئے لایا ہوں، اور ایک تفسیر عربی میرے ہاتھ میں دی جس کو میں پڑھنے لگا، اتنے میں آنکھیں کھل گئیں، اس خواب سے دل نہایت خوش ہوا کیوں کہ سفید کپڑے پہنے موتی کا خواب میں نظر آنا، اس کے بہشتی ہونے کی علامت ہے"۔[7]

تفسیر کی کتاب دینے کی تعبیر علامہ نیموی یہ کرتے ہیں کہ

”والد مرحوم نے جو خواب میں تفسیر عنایت فرمائی اس کی تعبیر بھی ظاہر ہو گئی کہ ایک مدت سے مؤلف علاوہ اور علوم کے طلبہ کو روزانہ تفسیر کا بھی ایک سبق پڑھاتا ہے، اور جمعہ و وعظ کے خیال سے مختلف تفسیریں دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے، بیشک وہ خواب رویائے صالحہ سے تھا“۔[8]

آگے انہوں نے والدین کے نام حسن سلوک اور والدہ کے خواب میں دیکھنے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

”جب جناب والد مرحوم نے انتقال فرمایا ہے، بفحوائے حدیث ولد صالح یدعو لہ راقم الحروف اکثر اوقات بعد نماز اپنے آباواجداد کے واسطے خصوصًا جناب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کیا کرتا ہے، اور کبھی کبھی ان کے لئے صدقات وخیرات بھی دیا کرتا ہے۔ مجھ کو ایک دفعہ عجب تشویش ہوئی کہ والد مرحوم کو تو کبھی کبھی خواب میں دیکھتا ہوں مگر والدہ مرحومہ کی زیارت سے کبھی خواب میں مشرف نہ ہوا، چنانچہ ۲۷ جمادی الآخرہ روز پنج شنبہ کو ۱۳۰۶ھ میں نہایت خلوص سے کچھ زر نقد فقرا کو دیا، اور اس کا ثواب جناب مرحومہ کو بخشا اور بارگاہ الٰہی میں زیارت کے لئے دعا کی، اس کی شان کریمی کے صدقے کہ اس کے دوسرے روز قبل نماز جمعہ عالم رویا میں جناب مرحومہ کو اہل جنت کی عمر میں سونے کے زیورات اور نہایت عمدہ کپڑے پہنے ہوئے رونق افروز پایا، بعد بیداری شکر خدا بجا لایا، اور نہایت ہی خوش ہوا، فالحمدللہ علی ذلک“۔[9]

آگے پھر والد کے متعلق فرماتے ہیں:

”بہرکیف حضرت والد مرحوم گندمی رنگ، چھریرا بدن، کچھ دراز قد تھے، ماتھے پر سجدے کا داغ چمکتا تھا“۔[10]

اپنے ذکر میں بھی والد اور والدہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”خدا بخشے میرے والد ماجد کا نام شیخ سبحان علی تھا، وہ مرحوم جناب شیخ دھومن مغفور بن شیخ فتح علی بن شیخ محمد وزیر بن شیخ محمد ولی بن شیخ غلام بدر بن شیخ عبد الہادی زاہدی مرحوم و مغفور صدیقی غفر اللہ لہم کے بیٹے تھے۔ اور میری والدہ مرحومہ کا نام، خدا بخشے، بی بی مصرن تھا، اور ان کے پدر بزرگوار کا نام شیخ روشن علی تھا، وہ موضع بایزید پور علاقہ باڑھ کے رہنے والے تھے، جناب شیخ حسن علی ابن شیخ جعفر علی مرحوم کے بیٹے تھے“۔[11]

الغرض حضرت نیموی نے ایسے گھرانہ میں نشوونما پائی جو آسودہ حال اور فارغ البال ہونے کے ساتھ علم و تعلیم سے بخوبی آشنا تھا، اور مذہبی قدروں کا حامل تھا، حضرت نیموی نے اپنے دادا شیخ دھومن علی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی ایسا جملہ نہیں لکھا ہے جس سے ان کی علمی لیاقت کا علم ہو، البتہ اپنے والد اور تین چچا کی علمی حیثیت پر کسی قدر روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ماحول علم آشنا تھا، یہ الگ بات ہے کہ خاندان میں عربی تعلیم جو اس وقت

اعلیٰ تعلیم تھی اس کا سراغ نہیں ملتا، فارسی کی تعلیم جسے دور حاضر کے گریجویشن کے مساوی تسلیم کیا جاسکتا ہے ان کے گھر میں پوری طرح موجود تھی۔ ان کی درج کردہ تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد خود بھی فارسی اور اردو شعر وادب کا ذوق رکھتے تھے، اور علماء سے بھی تعلق تھا۔

نام

علامہ شوق نیموی کا اصل نام ظہیر احسن ہے، اسی وزن پر ان کے بھائی کا نام نذیر احسن ہے، اور شوق تخلص ہے، اور وہ اپنے نام کے بجائے عام دنیا میں تخلص ہی سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے جب آثار السنن لکھی تو اپنے ہندوستان نام کے بجائے عربی نام لکھا ہے یعنی محمد ظہیر احسن سے صرف محمد اور والد کے نام سبحان علی سے صرف علی اخذ کر کے عربوں کے ذوق کے مطابق محمد بن علی النیموی لکھا، جس سے کچھ لوگوں سمجھ نہیں پاتے اور نام کے اختلاف کی وجہ سے دو الگ الگ شخصیت سمجھتے ہیں، یہی طریقہ ان کے معاصر اور استاد بھائی شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی مصنف الیانع الجنی نے بھی اختیار کیا، جن کا اصل نام محمد محسن بن غلام یحییٰ تھا، لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں اپنا نام محمد المدعو بمحسن بن یحییٰ لکھا۔ حضرت نیموی نے جابجا اپنے نام کے ساتھ اپنی کنیت ابوالخیر بھی لکھی ہے، گرچہ ان کی اولادوں میں خیر کسی کا نام نہیں تھا۔

ولادت

حضرت شوق کے شاگرد منشی بشیر کے بقول:

”مولانا شوق ۱۲۷۸ہجری میں ماہ جمادی الاولیٰ کی چوتھی تاریخ بدھ کے دن بوقت چاشت پیدا ہوئے، ظہیر الاسلام مادہ تاریخ ہے“۔[12]

یہ ان کی ابتدائی سوانح عمری کے الفاظ ہیں جو ان کی خونوشت سے پہلے لکھی گئی ہے، بعد میں انہوں نے جب اپنی خودنوشت لکھی تو اس میں تفصیل سے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

”راقم الحروف ۱۲۷۸ھ میں جمادی الاولیٰ کی چوتھی تاریخ بدھ کے روز کچھ دن چڑھے صالح پور میں اپنی خالہ کے گھر پیدا ہوا، محمد ظہیر احسن نام رکھا گیا، ابوالخیر کنیت اور ظہیر الاسلام مادہ تاریخ ہے“۔[13]

تعلیم

حضرت شوق نے لکھا ہے کہ

”جب میں پانچ چھ برس کا ہوا تو بسم اللہ ہوئی، اور مکتب میں بیٹھا، فارسی کی دو چار کتابیں پڑھ کے عربی بھی شروع کی، مختلف حضرات سے تعلیم ہوئی“۔[14]

یہ مختلف حضرات کون تھے اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا، نہ ان کے سوانح نگار کے یہاں نہ ان کے فرزند کی تحریر میں ملتا ہے، اس وقت ان کے وطن میں ایسے علماء کا سراغ تو نہیں ملتا البتہ ان کے قرب و جوار کی بستیوں میں کئی بستیاں اہلِ علم

سے آباد تھیں، جن میں مشہور بستی نگر نہسہ کا نام سب سے نمایاں ہے، ممکن ہے انہوں نے وہیں تعلیم حاصل کی ہو، علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے بھی وہاں تعلیم حاصل کی تھی۔

گلستان کی تعلیم کے وقت سے ہی وہ اشعار موزوں کرنے لگے تھے، اور بیت بازی میں شریک ہوتے تھے، جس سے اس دور کے شعری و ادبی ذوق و رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے بقول:

"جب عربی کی پانچ چھ کتابیں نکل گئیں تو شوقِ دل نے ابھارا کہ دیہات میں کب تک رہو گے، ذرا قدم باہر نکالو، اور شہر کی ہوا کھاؤ، پھر دیکھو تم کو تمہاری محنت کہاں سے کہاں پہنچاتی ہے، پہلے میں عظیم آباد پہنچا، اور استاد الفضلاء حضرت شمس العلما جناب مولانا محمد سعید حسرت نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضر ہوا، بعض کتابیں ان سے اور بعض اور حضرات سے پڑھیں"۔ [15]

بعض اور حضرات کون تھے، صاحب سوانح نے ان کا نام نہیں لیا ہے، ممکن ہے اس دور کے مشہور مدرس ملا کمال عظیم آبادی بھی اس میں شامل ہوں لیکن جب تک صراحت نہ ملے کوئی قطعی بات کہنا ناممکن ہے۔

البتہ علامہ سعید حسرت عظیم آبادی کے بارے میں کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں، وہ خود ایک باکمال استاد تھے، علومِ اسلامیہ اور نقد و ادب و شعر سب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، عظیم آباد کی علمی رونق ایک مدت تک ان کے دم سے قائم اور یہاں کی گلیاں ایک عرصہ تک ان کے ہنگامہائے تدریس سے پر شور رہیں، تشنگانِ علم کھنچ کھنچ کر ان کی خدمت میں آتے اور ان سے سیراب ہوتے رہے، وہ جامع الفنون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال مدرس، کامیاب استاد اور مردم ساز شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے تصنیف کتب سے زیادہ تصنیف رجال پر توجہ دی ہزاروں نوجوانوں نے ان سے فیض پایا، اور دسیوں باکمال ان کی درس گاہ سے اٹھے۔

علامہ شوق نیموی نے اگرچہ ان کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا ہے، صرف ان کی حوصلہ افزائی کا ایک مکتوب نقل کیا ہے جس سے ان کی علمی قدردانی اور اپنے تلامذہ کی حوصلہ افزائی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضرت شوق نیموی نے متوسطات تک کے علوم انہیں سے پڑھے ہوں گے اور اس کمال پختگی سے کہ اس کے بعد اونچی کتابوں کا سرسری مطالعہ یا کسی بڑے استاد کے سامنے ایک بار پڑھ لینا بھی کافی ہوتا ہے۔ اس صوبہ کے ایک دوسرے نامور محدث شیخ محسن بن یحییٰ خضر چکی ترہٹی مونگیری بھی انہیں کے شاگرد ہیں، افسوس کہ حضرت سعید عظیم آبادی کی شخصیت کے بہت سے پہلو ابھی تشنۂ تحقیق ہیں۔

لکھنؤ کے دوران قیام بھی وہ مولانا عظیم آبادی سے وابستہ رہے، ان کو ایک بار اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں جس پر انہوں نے بہت حوصلہ افزا خط لکھا، لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ [لکھنؤ کے دوران قیام] میں شمس العلماء جناب مولانا محمد سعید حسرت قدس سرہ کی خدمت بابرکت میں لکھنؤ سے یہ چند غزلیں میں نے بھیجیں، جن کی رسید میں حضرت مولانا عجب

عزت افزائی فرمائی‘‘۔

اس کے بعد اپنی چار غزلیں نقل کر کے لکھتے ہیں:

’’حضرت مولانا قدس سرہ نے ان غزلوں کی رسید میں مجھ کو اس نامہ سے سرفراز فرمایا۔

یگانۂ زمن بلبل نغمہ سرائے شعر و سخن سلمہ اللہ ذوالمنن

پس از سلام مسنون ممنون الاسلام وادعیہ وافیہ حصول مقصد و مرام واضح ضمیر محبت ارتسام باد کہ نامۂ محبت طراز ورقیمہ دل از غم پرواز باغزلہائے آبدار در شار بتاریخ چہارم ربیع الآخر روز شنبہ گوی گریبان ورود گردیدہ رانور و سینہ را سرور بخشیدہ ذوقی کہ بدیدین کلام حلاوت انضمام آن عزیز نصیب این مستہام گردید خارج از شرح و بیان و بیرون از احاطہ تقریر قلم و زبان است۔ بندہ ہر چہ از کوچہ اشعار اردو نابلد ہستم، لیکن این قدر می توانم گفت کہ لطف زبان وادابندی و نازک خیالی و تلاش مضامین ہمہ درین اشعار فراہم آمدہ آفرین بر قاطع و قاد و ذہن نقاد آن صاحب استعداد خداداد باد کہ درین کم عمری چندین علوم و فنون حاصل کردند، و آن چہ در بارہ دیوان پریشان فقیر نوشتہ اند مقتضائے محبت ایشان است، بالجملہ تمنائے راقم ہمین است کہ آن دیوان از اول تا آخر از نظر آن عزیز بگزرد، وای برجان سخن گر بہ سخن دان نہ رسد۔ و این خط از کمال شغف خاطر بآن عزیز بدست خود نوشتہ ام، فقط۔

اس وقت تک میری شاعری صرف غازی پور اور لکھنؤ تک ہی محدود تھی، اور تو اور، دو ایک کے سوا وطن کے حضرات بھی واقف نہ تھے کہ اس کو شعر و سخن کا بھی مشغلہ ہے‘‘۔[16]

علامہ نیموی کے بقول وہ عظیم آباد سے غازی پور چلے آئے، یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ اتفاق تھا یا کوئی اور وجہ تھی، بہر حال انہوں نے یہاں چند دن مولانا محمد رحمت اللہ فرنگی محلی کے یہاں قیام کیا، پھر غازی پور کے مشہور مدرس مولانا عبد اللہ غازی پوری سے آغاز تحصیل کیا، یہیں ان کے ذوقِ شعر و ادب نے بال و پر نکالے، طبیعت تو موزوں تھی ہی، فرنگی محل لکھنؤ کے ایک نامور شاعر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں فارسی کے مدرس اول تھے، مولانا عبد الاحد شمشاد لکھنوی، ان سے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی۔[17]

حضرت شوق نے عظیم آباد اور غازی پور میں تحصیل علم کی توقیت و تفصیل نہیں لکھی ہے، اور وہاں کن اساتذہ سے کیا پڑھنے کا موقع ملا اس کا بھی ذکر نہیں ہے، ہاں اپنے شعر و ادب کے استاد حضرت شمشاد لکھنوی بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور وہاں کی ادبی و شعری سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے وہاں انہوں نے حضرت شمشاد سے فارسی نثر کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں جو اس وقت رائج تھیں مکمل پڑھیں، ان کے بقول:

’’لطف یہ کہ حضرت شمشاد سے میں نے فارسی بھی شروع کر دی، سہ نثری ظہوری، قصائد عرفی، قصائد خاقانی، حدائق البلاغت ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، غرض کہ عربی، فارسی کی تحصیل میں، نظم و نثر

اردو کی مشق میں ہمہ تن مصروف ہوگیا، اکثر بارہ بجے رات تک اور کبھی دو ایک بجے تک کتابیں دیکھا کرتا، دماغ سوزی کیا کرتا، اللہ دے، بندہ لے، ادھر استاد کی شفقت ادھر اپنی محنت دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی"۔[18]

اس کا صحیح علم تو نہیں ہوتا کہ وہ کتنے سال غازی پور میں رہے، لیکن وہاں شعر و ادب کی دنیا میں وہ شہرت حاصل کر چکے تھے، وہیں سے انہوں نے لکھنؤ کے مشاعروں میں شرکت کی، وہیں سے حضرت تسلیم لکھنوی کی شاگردی اختیار کی، اور اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں اپنا کلام رامپور بھیجا جہاں وہ اس وقت نواب رامپور کے دربار سے وابستہ تھے، لیکن اصل حضرت شمشاد ہی کی رہی، یہاں تک کہ ان کا اعتماد ان کو حاصل ہوگیا، خود بھی مشاعرے میں شریک ہوئے اور خود مشاعروں کی مجلسیں بھی منعقد کیں، استاد کی جگہ پر طلبہ کو درس بھی دیا، انہوں نے وہاں کے قیام کا دورانیہ نہیں لکھا ہے لیکن بہ ظاہر وہ چار پانچ سال سے کم وہاں نہیں رہے، اس دوران انہوں نے اردو اور فارسی کے شعر و نثر میں کمال حاصل کر لیا، اور ادباء کے حلقہ سے انہیں سند قبولیت حاصل ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"فیض صحبت زیادہ تر مجھے حضرت شمشاد کی نصیب رہی، اور ان کی مجھ پر کچھ ایسی عنایت خاص تھی کہ بارہا خلعت نیابت سے سرفراز فرمایا، جب کبھی کہیں تشریف لے جاتے تو دوسرے طلبہ کی تعلیم میرے ہی سپرد کر جاتے، اور لوگوں کا حسن ظن کچھ ایسا میرے ساتھ بڑھا ہوا تھا کہ بارہا بعض تلامذۂ استاد نے اولا مجھ ہی کو دوستانہ کلام اپنا دکھایا، پھر حضرت استاد سے اصلاح لی"۔[19]

ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے غازی پور میں فارسی و اردو کی تحصیل ہی میں زیادہ وقت صرف کیا، عربی کی متوسطات شاید مولانا سعید عظیم آبادی سے پڑھ چکے تھے، بہر حال وہ ۱۳۰۰ھ سے قبل گھر واپس آگئے، کیوں کہ اسی سال انہوں نے اپنی شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ۱۳۰۰ھ نے اپنا جلوہ دکھایا تو جناب خالو شیخ بشارت علی عرف شیخ بودھائی صاحب صالح پوری بن شیخ منگا مرحوم بن شیخ پیر علی مرحوم کی بڑی لڑکی سے جمادی الآخرہ کی بارہویں تاریخ شب جمعہ کو میری شادی ہوئی، جس کی تاریخ شمس العلماء جناب مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی نور اللہ مرقدہ نے یوں ارشاد فرمائی:

مشفقی مولوی ظہیر احسن کتخدا گشت چون بفضل خدا
سال تاریخ شد بروے جمیل ازدواج ظہیر احسن ما"۔[20]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد مولانا سعید عظیم آبادی کی ان پر اخیر وقت تک خاص عنایت رہی، اس سے میرے مذکورہ بالا تصریحات کی توثیق ہوتی ہے۔

اس وقت تک ان کی عمر تقریباً بیس بائیس سال کی ہوگی جو علومِ متوسطہ کی تکمیل کا زمانہ ہوتا ہے، اس دور کے عام مذاق کے مطابق علمِ حدیث کی تحصیل سب سے اخیر میں کی جاتی تھی، اور ایک ڈیڑھ سال میں اس کی تکمیل پر سند فراغت حاصل ہوجاتی تھی۔ چنانچہ شادی کے بعد انہیں بھی اس کا خیال آیا، خود ان کے بقول:

”شادی کے بعد یہ قصد ہوا کہ اب لکھنؤ چل کے تحصیل علم کیجئے، اور وہاں کی بہار لوٹیے، یہ قصد کر کے میں نیمی سے غازی پور پہنچا، اور دو چار روز رہ کے وہاں سے رخصت ہوا، احباب غازی پور گنگا کنارے تک پہنچانے آئے۔ برسات کا زمانہ تھا،... المختصر جوں توں وہاں سے بیڑا پار ہوا، اور ریل پر سوار ہوا، رمضان پور علاقہ بہار کے رہنے والے مولوی محمد ابراہیم صاحب ساتھ تھے، دونوں آدمی خدا خدا کر کے لکھنؤ پہنچے، شب بھر وہاں رہ کے اور کل اسباب ان کے سپرد کر کے میں پھر ریل گاڑی میں سوار ہوا، اور سنبھل، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا، اور حضرت استادی جناب تسلیم کی ملازمت سے مشرف ہوا، ہفتہ عشرہ وہاں رہ کے مراجعت کی، ایک زمانے سے جامع شریعت غرا مجمع طریقت بیضا، مخزن عرفان، معدن ایقان حضرت سیدنا مولانا فضل رحمن مدظلہ کی قدم بوسی کی تمنا تھی، سندیلہ میں ریل گاڑی سے اتر گیا، اور وہاں سے قصبہ گنج مراد آباد پہنچا، زیارت سے مشرف ہو کر حضرت اقدس کے دست مبارک پر بیعت کی، پھر وہاں سے میں لکھنؤ پہنچا، اور زبدۃ المحدثین عمدۃ المتفقہین حضرت مولانا ابوالحسنات محمد عبدالعلی فرنگی محلی نور اللہ مرقدہ کے حلقۂ تعلیم میں قراءۃً و سماعاً علومِ عربیہ کی تکمیل کرنے لگا“۔[21]

ان کے شاگرد کے منشی بشیر کے بقول انہوں نے

”۱۳۰۱ھ میں عارف کامل جناب مولانا شاہ فضل الرحمن مدظلہم متوطن قصبہ مراد آباد من مضافات لکھنؤ کے ہاتھ پر بیعت کی“۔[22]

گویا ۱۳۰۲ھ میں انہوں نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی خدمت میں حاضری دی اور تحصیل کی، انہوں نے اس کی تفصیل نہیں لکھی ہے کہ کتنے سال ان کی خدمت میں رہے، انہوں نے وہاں طب کی بھی تحصیل کی، ایک شیعہ حکیم سید باقر حسین ساکن محلہ پاٹانالہ سے طب پڑھی، اس کی سند کی اسانید کے مجموعہ میں موجود ہے۔

مولانا فرنگی محلی کے ذکر میں انہوں نے بہت اجمال سے کام لیا ہے، اس سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے علم و فکر سے وہ کس قدر متاثر ہوئے، اور کتنی مدت تک ان کی صحبت اٹھائی۔ اسی دوران مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ۱۳۰۴ھ میں اچانک عین عالمِ شباب میں وفات پائی، اس لئے بہت ممکن ہے کہ علامہ نیموی کو ان کے آخری دور کے افکار و آراء سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا ہوگا، جس کو انہوں نے آگے بڑھایا، لیکن اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ ویسے اہلِ نظر کی رائے ہے کہ وہ فنِ حدیث میں اپنے استاد مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے ممتاز ہیں، نیز علامہ فرنگی محلی نے بہت سی جگہ فقہ حنفی کے برعکس

دوسری آراء قبول کرلی ہیں جب کہ علامہ شوق نیموی کے یہاں ایسا نہیں نظر آتا، وہ ہر حال میں فقہ حنفی کی عظمت ثابت کرتے ہیں، اس کی تفصیل اپنی جگہ آگے آئے گی۔

حضرت شوق لکھنؤ میں چار پانچ سال رہے، اس دوران وہاں کی ادبی فضا ان کے نغموں سے معمور رہی، اساطین فن اور استادان سخن نے ان کی خوب پذیرائی کی، ان کی تخلیقات کی دھوم مچ گئی، یہیں انہوں نے اپنی مشہور زمانہ مثنوی نغمۂ راز لکھی، جس کی پوری اردو دنیا میں دھوم مچ گئی۔ اسی دورانیہ میں ان کی تین معرکہ آرا لسانی و ادبی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور ملک میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، جس نے پوری اردو دنیا میں جلد ہی ان کو متعارف کرایا اور شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا۔ اردو کے مشہور و معروف رسائل و اخبارات نے ان پر تقریظیں لکھیں، تبصرے کئے، اور دل کھول کر ان کی پذیرائی کی۔ ان کے تینوں لسانی رسائل، ازاحۃ الاغلاط، اصلاح، اور اس کے حواشی ایضاح اسی دور میں شائع ہوئے۔ ان کا یہی رسالہ ازاحۃ الاغلاط جلال لکھنوی اور ان کے درمیان اس تاریخی ادبی معرکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا، جس میں انہیں فتح حاصل ہوئی، اور اس کی گونج ایک مدت تک دنیائے ادب میں سنائی دیتی رہی، اور یہ معرکہ ہمیشہ کے لئے اردو کی ادبی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کی تفصیل خود حضرت شوق نے بہت تفصیل سے لکھی ہے، اور ادب کی تاریخ میں معروف ہے اس لئے اس کی تفصیل یہاں قلم انداز کی جاتی ہے۔

منشی بشیر کے بقول:

> ”لکھنؤ کے بڑے بڑے نامی شاعر مولانا شوق سے نہایت تپاک سے ملتے اور کمال شوق سے آپ کا کلام سنتے، جناب امیر وغیرہ سے نہایت ارتباط تھا“۔ [23]

ان رسائل کے شائع ہوتے ہی دسیوں اہل کمال نے انہیں مبارک بادی اور تہنیت و قدردانی کا خط لکھا، اور اس کاوش پر ان کا شکریہ ادا کیا، حضرت شوق کے بقول:

> ”یہ کل ریویو اور تحریریں ان حضرات کی ہیں جن سے نہ تو صاحب سلامت تھی اور نہ ان کو مجھ سے کسی قسم کا تعلق تھا، ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے محض آزادی سے لکھا ہے“۔ [24]

انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ”اگر حضرات ناظرین مجھ کو حقیقت نگاری کی اجازت دیتے ہیں تو مجھے اس امر کے اظہار میں ذرا تامل نہیں کہ خدا کے فضل سے ہندوستان میں شاید کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں میری تالیف و تصنیف نے جلوہ نہ دکھایا ہو، اور اپنا رنگ نہ جمایا ہو“۔

اخیر میں انہوں نے اپنے لکھنؤ کے قیام کا خلاصہ ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> ”المختصر میں جب تک لکھنؤ میں رہا، تحصیلِ علومِ عربیہ میں سرگرم رہا، مگر جب کچھ فرصت ملتی تو اردو فارسی کا بھی مشغلہ رکھتا تھا“۔ [25]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پورا زمانہ تحصیلِ علم میں ہی گذرا، البتہ دوسری سرگرمیاں بھی اس کے ساتھ رہیں، لیکن انہوں نے کیا کیا پڑھا اور کن اساتذہ سے پڑھا اس کی تفصیل نہ انہوں نے ذکر کی ہے نہ ان کے سوانح نگار نے۔

البتہ خود انہوں نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسی دوران انہوں نے لکھنؤ کے محلہ پاٹا نالہ کے ایک قدیم حکیم اور شیعی فاضل سید باقر حسین لکھنوی سے علمِ طب کی تحصیل کی۔[26] انہوں نے حضرت نیموی کو تکمیلِ طب کی جو سند یا شہادت دی تھی وہ ان کے کاغذات میں محفوظ تھی، ان کے فرزند نے یہ سند درج کی ہے، لکھتے ہیں:

"آپ نے مولانا شوق کو جو علمِ طب کی سند عطا فرمائی ہے وہ درج ذیل ہے:

یا فتاح ... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی علمنا علوم الادیان والابدان، ونزل علینا القرآن لتداوی بہ امراض الجنان، والصلاۃ والسلام علی الحاذق الذی بعث الینا وحمانا عن آفات الکفر والضلال، وشفانا عن الاسقام، التی تسری فی صدور الجہال، وعلیٰ آلہ الطاہرین والائمۃ المطہرین رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اما بعد، فیقول العبد المعتصم بحبل اللہ القوی خادم الاطباء السید باقر حسین اللکنوی ان جامع العلوم العقلیہ وواقف الفنون النقلیہ الذکی اللوذعی الفطین الیلمعی، المولوی محمد ظہیر احسن النیموی العظیم آبادی حفظہ اللہ ذو الایادی الولد الرشید للشیخ سبحان علی غفر اللہ ذنبہ الخفی والجلی، حضر عندی وقرا لدي الکتب الطبیہ المتداولۃ باحثاً عن غوامضہا ومشکلاتہا وغائراً فی تدقیقاتہا ومعضلاتہا، وجلس فی مطبی مدۃ مدیدۃ، واخذ منی فوائد عدیدۃ، فاستجاز منی کما ہو داب المحصلین، فاجزتہ مشترطاً بان لایجیز [؟] بمجرد رایہ علی المداوات والمعالجات غافلاً عما فی اسفار الاکابر وکتب الثقات بل یحتاط فی ھذ االباب غایۃ الاحتیاط، ویسلک بامعان النظر والفکر سواء الصراط۔

والمسؤول عن الحکیم الوہاب ان یفیض علینا وعلیہ الہام الصدق والصواب وھوعلی کل شیئ قدیر وباجابۃ الادعیۃ جدیر۔

اقل الاطبا باقر حسین ۱۳۰۴ھ

باقر حسین ۱۲۹۴ھ (مہر)"[27]

۱۳۰۴ھ میں انہوں نے تکمیلِ تعلیم کی اور لکھنؤ سے عظیم آباد واپس ہوئے، ۱۳۰۵ھ میں شوال کے مہینہ میں مع الخیر وطن پہنچے، ان کو ازاحۃ الاغلاط کے جواب میں حضرت جلال لکھنوی کی ردِ تردید واپسی سے قبل ہی مل چکی تھی، لیکن وہ وطن کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے اس لئے اس کو ساتھ لے آئے اور یہاں آکر اس کا جواب لکھا، جو سرمۂ تحقیق کے نام سے شائع ہوا، اسی کے حاشیہ پر ان کے حالات پر ان کے شاگرد منشی بشیر کا رسالہ بھی شائع ہوا، جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس وقت تک ان کی شخصیت اتنی نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ کسی رسالہ کا موضوع بن سکیں۔

جلال لکھنوی اس جوابی رسالہ کا جواب تو نہ دے سکے البتہ انہوں نے اپنی خجالت دور کرنے کے لئے حضرت شوق کے نام سے ایک جعلی معذرت نامہ گلدستہ نغمۂ بہار میں شائع کروایا، اس کے جواب میں حضرت شوق نے لکھنؤ کے اخبارات میں کئی مضامین لکھے، اور اپنا مدعا ثابت کیا، اس معرکہ میں دونوں طرف سے بہت سے دیگر اہلِ علم نے بھی حصہ لیا، اکثر حضرات شوق کی تائید میں تھے، اس طرح اس ادبی معرکہ میں انہیں فتح حاصل ہوئی، اور یہ معرکہ اردو کی ادبی تاریخ کا ایک یادگار بن گیا۔

عظیم آباد کا قیام اور علمی خدمات

۱۳۰۵ھ میں وطن واپس آئے تو اپنے شہر عظیم آباد میں طرح اقامت ڈالی، یہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے بھی ربط رہا، وہ اپنی تمام ادبی سرگرمیوں اور نظریات کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اب میں اپنے دوسرے حالات مجملاً لکھتا ہوں کہ جب میں فارغ التحصیل ہو کر لکھنؤ سے نیمی پہنچا تو کچھ دنوں وہاں رہ کے شہر عظیم آباد میں جو نیمی سے چھ کوس کے فاصلہ پر ہے طرح اقامت ڈالی، طبابت کے ساتھ کتب عربیہ، معقولات و منقولات پڑھانا شروع کیں، اور دینیات میں تالیفات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، چنانچہ ان میں سے بعض رسائل چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، چنانچہ تقلید کی بحث میں اوشحۃ الجید اور آمین کے باب میں حبل المتین یہ دو رسالے ایسے پر زور لکھے کہ جو لوگ تقلید کو مذموم سمجھے تھے یا آمین بالجہر کی قوت کے قائل تھے ان میں سے اکثر غیر متعصب حضرات کے خیالات پلٹ گئے۔ آج کل بطور مشکاۃ شریف حدیث میں آثار السنن نام ایک کتاب کی بنائے تالیف ڈالی ہے، جس کے لئے بلاد مختلف خصوصاً مصر و روم و حرمین شریفین کا سفر در کار ہے، السعی منی والاتمام من اللہ، اگر یہ کتاب تیار ہو گئی تو ان شاء اللہ تعالیٰ حنفیہ کے لئے نہایت بکار آمد ہو گی"۔ [28]

"کئی سال سے اکثر جمعہ کو وعظ کہنے کا اتفاق ہوتا ہے، آج تک چھ پارے ہو چکے ہیں، اگر حیات مستعار باقی ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ قرآن مجید و فرقان حمید کو سر منبر تمام کروں گا"۔ [29]

حضرت شوق نے یادگار وطن ۱۳۱۲ھ میں شائع کی ہے، اس کے بعد وہ وفات تک عظیم آباد ہی میں رہے، اور یہیں ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، تقریبًا سترہ اٹھارہ سال کا یہ عرصہ انہوں نے علم وادب کی خدمت ہی میں بسر کیا۔ اس دوران عجب نہیں کہ ایک بار نہیں کئی بار انہیں قرآن پاک کی تفسیر مکمل کرنے کا موقع ملا ہو، یہ درس قرآن کا نظام بھی اس دور میں خال خال ہی نظر آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس شہر میں جو خدمات انجام دیں ان میں قرآن پاک کو عام کرنے کا کام بھی تھا، جو حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان میں نظر آتا ہے۔ حضرت شوق نے تدریسی خدمت کس جگہ انجام دی، آیا وہ جہاں مطب کرتے تھے وہیں تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، یا پھر عظیم آباد میں جو مدرسے یا مدرسین تھے ان کے یہاں تعلیم دیتے تھے، جن میں کئی نام ملتے ہیں، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، نہ ان کے علوم اسلامیہ کے شاگردوں کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے تلامذۂ شاعری کا ذکر تو کیا ہے لیکن علومِ اسلامیہ کے تلامذہ کا ذکر نہیں کیا ہے، نہ ان کی سندِ حدیث کے سلسلہ کا کہیں سراغ ملتا ہے کہ وہ جاری ہے کہ نہیں، ان کے فرزند بھی اس سلسلہ میں خاموش نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک معاصر مورخ بدر الحسن عظیم آبادی نے ان کے طبابت کا مشاہدہ ذکر کیا ہے جس سے ان کی بعض خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے، لکھتے ہیں:

> ”مولوی ظہیر احسن صاحب نیموی... سالار پور [نیمی کا نام] کے رہنے والے ہیں، اور شاہ کی املی [محلہ عظیم آباد، موجودہ پٹنہ سیٹی،] میں رہتے ہیں،... مطب میں پورا فروغ تو نہ تھا، لیکن غرباء ان کے زیر علاج رہے، امیروں میں ان کا علاج کم رہا، ان کو شغل پڑھانے اور شاعری کا زیادہ رہا“۔ [30]

ان کے تقریبًا دس سال کے قیام عظیم آباد کی تفصیل کسی شاگرد یا اہلِ تعلق نے قلمبند نہیں کی، جس سے ان کی سوانح زندگی کا اصل ورق ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، البتہ ان کی ادبی سرگرمیوں کا جابجا کچھ ذکر مل جاتا ہے۔

حوالہ جات

1. یادگار وطن، ص ۱۱۷۔
2. ص ۱۴ سے اس کا آغاز ہوتا ہے، (مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ۔)
3. یہ کتاب خدابخش لائبریری کی اردو مخطوطات کی مطبوعہ فہرست کنزالعلوم (مطبوعہ خدابخش) میں مطبوعہ بتائی گئی ہے، لیکن میرے علم کے مطابق اب تک پوری کتاب نہیں شائع ہوئی۔
4. دیکھئے یادگار وطن، ص ۱۵۶
5. سیر بنگال، ص ۱۲، طبع اول
6. حوالہ سابق، ص ۷۔ القول الحسن میں مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کا جواب دیتے ہوئے حضرت نیموی کے فرزند مولانا عبدالرشید فوقانی نے بھی جابجا علامہ شوق نیموی سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے۔

7. حوالہ سابق، ص ۲۹،۔۳۰۔
8. حوالہ سابق ص ۳۱
9. حوالہ سابق
10. حوالہ سابق ص ۳۳
11. حوالہ سابق ص ۴۹۔
12. تذکرۃ الشوق، ص ۴۱
13. یادگار وطن ص ۴۹
14. حوالہ سابق۔
15. حوالہ سابق ص ۵۰
16. یادگار وطن، ص ۶۳
17. حوالہ سابق ص ۵۱
18. حوالہ سابق ص ۵۳
19. ص ۵۹
20. حوالہ سابق۔
21. حوالہ سابق،
22. تذکرہ الشوق، ص ۴۳
23. تذکرۃ الشوق، ص ۴۴
24. یادگار وطن، ص ۲۷
25. حوالہ سابق۔
26. حوالہ سابق۔
27. القول الحسن ص ۱۶۶۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۲۔
28. حوالہ سابق ص ۱۱۹۔
29. حوالہ سابق۔
30. یادگار روزگار از بدر الحسن، خدابخش لائبریری پٹنہ، ص ۵۲۷

(جاری)

فحاشی و عُریانی اور لباس و نظر کا نفسیاتی مطالعہ!

محمد عرفان ندیم

psychology of gaze یا ”نظر کی نفسیات“ ایسا علم ہے جس میں لباس اور نظر کے باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ علم انسانی نظر کے رویے، توجہ اور دیکھنے کا مطالعہ کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ لوگ کس طرح دیکھتے ہیں، کس چیز کو دیکھتے ہیں، کس چیز کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، کس چیز پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ان کی نظروں کا اثر دوسروں پر کیسا پڑتا ہے۔

ایک معروف مغربی یونیورسٹی میں خواتین کے لباس کے حوالے سے تحقیق کی گئی، تحقیق سے پتا چلا خواتین کا لباس نہ صرف لوگوں کے رویوں پر اثرانداز ہوتا ہے بلکہ یہ خواتین کی شخصیت کے بارے تاثرات قائم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ مطالعے کے دوران دو خواتین کو ایک جیسے حالات میں مختلف لباسوں میں عوامی مقامات پر بھیجا گیا، ایک عورت نے عبایا پہنا ہوا تھا اور دوسری عورت نے جدید اور مختصر لباس۔ عبایا میں ملبوس خاتون کو زیادہ تر افراد نے احترام کی نظر سے دیکھا اور ان کا دیکھنے کا دورانیہ بھی کم رہا۔ لوگوں نے خاتون سے فاصلہ برقرار رکھا اور اس کے قریب جانے سے گریز کیا۔ جبکہ مختصر لباس والی خاتون کی طرف لوگوں نے زیادہ دیر تک دیکھا اور لوگوں کی نظروں میں زیادہ ”جانچنے اور تجسس“ کا عنصر پایا گیا۔

لباس کا تعلق محض ظاہری شکل و صورت سے نہیں ہوتا بلکہ یہ انسان کی باطنی شخصیت، تہذیبی پس منظر اور دینی عقائد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلام میں حیا کو ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے اور حیا کا واضح اظہار انسان کے لباس سے ہوتا ہے۔ جب جنت میں آدمؑ و حواؑ بے لباس ہوئے تو انہوں نے فوراً درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو چھپانا شروع کر دیا۔ حضرت آدم و حوا کو کسی نے بتایا نہیں تھا کہ ان کا ستر واضح ہو گیا ہے بلکہ ان کی فطرت نے انہیں اپنے جسم کو چھپانے کی طرف متوجہ کیا۔ آدم و حوا کا یہ واقعہ انسانی فطرت میں ستر اور حیا کے جذبے کی گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی بچہ جب چار پانچ سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو سب کے سامنے بے لباس ہونے کو معیوب سمجھتا ہے، اسے بھی کسی نے بتایا نہیں ہوتا کہ تمہارا

ستر عیاں ہو رہا ہے بلکہ اس کی فطرت اسے ایسا کرنے سے منع کرتی ہے۔

شرم و حیا کا تصور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے وہ الگ بات ہے کہ آج ہماری فطرت مسخ ہو چکی ہے اور ہم بطور فخر جسم کی نمائش کرتے اور اسے "فن" سمجھتے ہیں۔ فطرت مسخ ہونے سے ہمارا تصورِ حسن تک بدل گیا ہے اور جو جتنا برہنا ہوتا ہے اسے اتنا خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ جو جتنا "شارٹ" لباس پہنتا ہے اسے اتنا حسین تصور کیا جاتا ہے۔ یہ عمل مذہب کے خلاف تو ہے ہی لیکن بنیادی انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں لباس اور پردے کے حوالے سے خواتین کو واضح ہدایات دی ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ باریک کپڑوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تشریف لائیں تو آپؐ نے فرمایا: "اے اسماءؓ! جب عورت بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آنا چاہیے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے۔"

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دوزخیوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا، ان میں سے ایک وہ خواتین ہیں جو لباس پہن کر بھی ننگی ہیں (یعنی تنگ اور باریک لباس پہنتی ہیں) وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی حالانکہ جنت کی خوشبو بہت دور تک آ رہی ہو گی۔"

جب ہم تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں طالبات کے لباس کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں تو اس کا مقصد کسی طبقے کو نشانہ بنانا نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں ان اقدار کو اجاگر کرنا ہوتا ہے جو نہ صرف ہماری دینی تعلیمات کا حصہ ہیں بلکہ بنیادی انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہیں۔ آج کل یونیورسٹیز میں مغربی طرزِ لباس اس قدر عام ہو چکا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی مغربی ملک کی جامعہ میں کھڑا ہے یا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہے۔ جامعات میں طالبات کا غیر مناسب لباس نہ صرف ان کی اپنی شخصیت کو منفی طور پر پیش کرتا ہے بلکہ تعلیمی ماحول میں غیر ضروری تفریح اور غیر اخلاقی رجحانات کو بھی فروغ دیتا ہے۔

باریک، تنگ یا غیر مناسب لباس نہ صرف طالبات کو غیر ضروری توجہ کا مرکز بناتا ہے بلکہ بسا اوقات ان کی عزت اور تحفظ کے لیے بھی خطرہ بن جاتا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہماری مڈل کلاس ایلیٹ کلاس کو فالو کرتی ہے اور ایلیٹ کلاس مغرب کو فالو کرتی ہے۔ مغرب میں جو بھی نیا فیشن اور رجحان سامنے آتا ہے اسے ایلیٹ کلاس کے ذریعے فلموں اور ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ اور فلموں، ڈراموں اور سوشل میڈیا کے ذریعے یہ چیزیں مڈل کلاس میں فروغ پانا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح نوجوان نسل کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ ترقی اور ماڈرن طرزِ زندگی اپنانے کے لیے اپنی ثقافت اور دینی اصولوں کو ترک کرنا اور مغربی طرزِ زندگی کو اپنانا ضروری ہے۔

مخلوط تعلیم میں لڑکے لڑکیوں کا ایک ساتھ بیٹھنے کا تجربہ انہیں ایک ایسی عادت کا شکار بنا دیتا ہے جو عموماً ازدواجی زندگی میں مسائل کا سبب بنتی ہے۔ مسلسل ایک ساتھ بیٹھنے اور بے تکلفی اختیار کرنے سے ایک خاص طرح کی لذت کا احساس

ہوتا ہے۔ یہ لذت دراصل ''ڈوپامین'' جیسے کیمیکلز کے اخراج سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ کیمیکل جب پہلی بار خارج ہوتا ہے تو ایک خاص لطف کا احساس دیتا ہے۔ مسلسل مخلوط ماحول میں رہنے سے لڑکے لڑکیاں اس کیمیکل کے اخراج کے عادی ہو جاتے ہیں اور نکاح کے بعد لطف کی یہ کمی ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نکاح کے بعد جو رشتہ بنتا ہے، مخلوط ماحول میں بننے والے تعلقات کی وجہ سے اس میں لطف اور احترام کی کمی محسوس ہوتی ہے جس سے ازدواجی زندگی کے مسائل جنم لیتے ہیں۔

مخلوط تعلیم میں جنم لینے والی اخلاقی برائیوں میں سے ایک یہ ہے کہ طلباء کی توجہ تعلیم سے ہٹ کر غیر ضروری باتوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم کے بجائے ایک دوسرے پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے لباس، بات چیت کے انداز اور رویوں میں مصنوعی پن لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی اصلی شخصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مصنوعی طور پر جنس مخالف کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے ان کے کردار اور اخلاقیات میں منفی رویے جنم لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی میں ایک طرح کی بے سکونی اور کھوکھلا پن پیدا ہوتا ہے، اور ان کا وقت حقیقت پر مبنی رویے سیکھنے کے بجائے غیر ضروری باتوں اور بے مقصد سرگرمیوں میں ضائع ہونے لگتا ہے۔ تعلیم کے بجائے ان کی توجہ بات چیت، دوستی، ایک دوسرے کو متاثر کرنے، اور غیر ضروری سرگرمیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے، جس سے ان کا تعلیمی ہدف پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

مخلوط اداروں میں پڑھنے والی لڑکیوں میں ایک رجحان یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جو لڑکیاں عموماً پہلے سمسٹر میں عبایا پہنتی ہیں وہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے لباس اور طرز زندگی میں تبدیلیاں لے آتی ہیں۔ ان پر فیشن اور جدید رجحانات کا اثر غالب آنے لگتا ہے اور صرف چند سمسٹر بعد ان کا عبایا اتر جاتا اور وہ بھی فیشن کی دوڑ میں شامل ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں یونیورسٹیوں کی نگرانی اور پالیسیاں بنانے میں ایچ ای سی اہم کردار ادا کرتا ہے، تاہم طالبات کے لباس اور اسلامی اقدار کے فروغ کے حوالے سے ایچ ای سی کی کارکردگی مایوس کن رہی ہے۔ بیشتر یونیورسٹیوں میں لباس کے حوالے سے کوئی واضح ضابطہ موجود نہیں ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے اپنے طور پر لباس کے حوالے سے اصول وضوابط بنانے اور اپنانے کی کوشش کی لیکن انہیں شدید تنقید اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ایچ ای سی نے ان اداروں کی حمایت کے بجائے خاموشی اختیار کی جو افسوسناک رویہ ہے۔ بحیثیت قومی ادارہ ایچ ای سی کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف معیاری تعلیم کو فروغ دے بلکہ تعلیمی ماحول کو اسلامی اقدار کے مطابق ڈھالنے میں بھی کردار ادا کرے۔ ایچ ای سی نہ صرف لباس کے ضابطے کے لیے پالیسی وضع کرے بلکہ اس پر عمل درآمد کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ کو پابند بھی کرے۔

اس سلسلے میں سماج کو بھی اپنا کردار ادا کرنے اور عملی اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے، مثلاً یونیورسٹی سطح پر ایسی مہمات چلائی جائیں جو طلبہ وطالبات کو حیا، پردے اور اسلامی لباس کی اہمیت سے روشناس کرائیں۔ اساتذہ کو اس بات کی تربیت دی جائے کہ وہ اپنے طرزِ عمل اور لباس کے ذریعے طلبہ کے لیے ایک مثال بن سکیں۔ اسلامی اخلاقیات، حیا اور

لباس کے اصولوں کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ چیزیں نارمل ہو چکی ہیں اور ہمارا تصورِ گناہ تک مسخ ہو چکا ہے۔ اور ہم گناہ کو گناہ سمجھنے کی صلاحیت بھی کھو چکے ہیں، گویا ہم ایمان کے آخری درجے سے بھی نیچے جا چکے ہیں۔ اور اگر ہمارا یہ حال ہے تو ہماری آئندہ نسلوں کا کیا حال ہو گا؟ بحیثیت مسلمان آج ہمارے لیے یہ سب سے اہم اور سنجیدہ سوال ہے۔

psychology of gaze کی طرح psychology of dress ''لباس کی نفسیات'' کا علم بھی اس مسئلے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ لباس کی نفسیات میں انسانی لباس کے انتخاب، سماج پر اس کے اثرات؛ اور اس کے پیچھے موجود ذہنی، سماجی اور ثقافتی عوامل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس علم کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا جب نفسیات اور سماجیات کے ماہرین نے لباس اور سماج کے باہمی تعلق کا مطالعہ شروع کیا۔ مغربی دنیا میں اس موضوع پر ابتدائی کام مشہور نفسیات دان ولیم جیمز اور ماہر سماجیات تھارن اسٹائن وِیبلین نے کیا۔ بعد میں بیسویں صدی کے وسط میں فیشن اور نفسیات کے باہمی تعلق پر مزید تحقیق کی گئی، جس میں یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ کس طرح لوگ لباس کے ذریعے اپنی شناخت، رویے اور سماجی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

psychology of dress پر غور کیا جائے تو کچھ اہم حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ لباس انسانی نفسیات اور رویوں پر کچھ اس طرح اثرانداز ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ صاحبِ لباس کی شخصیت اور رویے کا اظہار کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف دیکھنے والوں کے ذہن میں ایک تاثر پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اپنے جسم کو چھپانا بنیادی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اور اگر کوئی مرد و عورت اپنی فطرت سے ہٹ کر کوئی لباس پہنتا اور اپنے جسم کی نمائش کرتا ہے تو اس کے لباس کی نفسیات سماج کو ایک پیغام دے رہی ہوتی ہیں۔ یہ پیغام جب سماج سے ٹکراتا ہے تو سماج کا وہ طبقہ جو جنسی خواہشات پر قابو نہیں رکھتا وہ جرائم کے ارتکاب کی کوشش کرتا ہے، اور یہ کوشش عموماً کسی گھناؤنے جرم کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

یہ بات تسلیم کہ صرف لباس ہی جنسی جرائم کی وجہ نہیں بنتا ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ وجوہات مثلاً اخلاقی تربیت کی کمی، جنسی بے راہ روی کی ترویج، میڈیا کے ذریعے غیر اخلاقی مواد کی فراہمی، قانون کی کمزوری، جرائم کی عدمِ سزا، اور مرد اور عورت کے درمیان حدود کا ختم ہونا بھی ان جرائم کی اہم وجوہات ہیں، لیکن لباس کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کا اہم اور ابتدائی عامل ہوتا ہے اور یہیں سے جنسی جرائم کی نفسیات پروان چڑھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عورت کی حیا اور مرد کی فطرت کے بارے میں جو رہنمائی فراہم کی ہے وہ انسانی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم کی ازواجِ مطہرات کو ہدایت دی گئی ہے کہ اپنی آوازوں کو نیچا رکھیں تاکہ کوئی شخص جس کے دل میں مرض ہے وہ بہک نہ جائے اور آپ میں دلچسپی لے کر نہ بیٹھ جائے۔ یہ آیت صرف ازواجِ مطہرات کے لیے نہیں بلکہ تمام مسلمان خواتین کے لیے رہنما اصول ہے۔ یہ آیت ایک طرف خواتین کی عفت و حیا کی

نشان دہی کرتی ہے اور دوسری طرف مرد کی نفسیات اور مرد کے سماجی رویوں کو سمجھنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔ مرد کی فطرت کو اللہ نے عورت کی طرف مائل پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت کی آواز کو بھی مرد کے بہکنے کا سبب ٹھہرایا ہے۔ اگر عورت کی صرف آواز سے مرد بہک سکتا ہے تو اس کے غیر مناسب لباس کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

آج بحیثیت مجموعی سماج میں خواتین کے لباس کے نام سے جس چیز کو پروان چڑھایا جا رہا ہے، یہ نہ صرف مردوں کی فطرت کو آزمانے کے مترادف ہے بلکہ معاشرے میں اخلاقی زوال کا اہم سبب بھی ہے۔ ۲۰۲۳ء میں خواتین کے خلاف ہراسانی کے ۴۵۰۰ سے زائد کیسز رپورٹ ہوئے جن میں سے ایک بڑی تعداد تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں سے متعلق تھی۔ یہ اعداد و شمار ہمارے تعلیمی اداروں میں خواتین کے لباس اور مخلوط ماحول کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ غیر مناسب لباس، مخلوط ماحول اور دینی تعلیمات سے دوری ان مسائل کے بڑے عوامل ہیں۔

دوسری طرف عالمی سطح پر ایسے تجربات کیے گئے ہیں جنہوں نے لباس اور انسانی رویوں کے درمیان تعلق کو واضح کیا ہے اور ہم پچھلے کالم میں اس پر بات کر چکے ہیں۔ اسلام نے عورت کی عزت اور وقار کے تحفظ کے لیے پردے کا جو نظام متعارف کروایا ہے اس کا مقصد عورت کو صرف جسمانی طور پر محفوظ رکھنا نہیں بلکہ اسے اخلاقی تحفظ بھی فراہم کرنا ہے۔ معاشرتی اثرات کے تناظر میں دیکھا جائے تو عورت کا غیر مناسب لباس صرف مردوں کی فطرت کو ہی نہیں بلکہ پورے معاشرتی توازن کو متاثر کرتی ہے۔

جب عورتوں کے لباس پر بات کی جاتی ہے تو عموماً یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ کیا چھوٹی بچیوں کے ساتھ ریپ بھی ان کے لباس کی وجہ سے ہوتا ہے؟ ہم پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ جنسی زیادتی جیسے جرائم کبھی بھی صرف عورت کے لباس یا اس کے جسمانی ظہور کی وجہ سے نہیں ہوتی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرح کے جرائم کی مختلف وجوہات میں سے ایک اہم وجہ عورت کا غیر مناسب لباس ہی ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات اور دنیا بھر کے حقوق انسانی کے اصول یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرتی ماحول، عورت کا غیر مناسب لباس، مرد و عورت کے مابین حدود کو ختم کرنا اور ان کی اخلاقی تربیت کی کمی ایسے جرائم کی اہم وجہ ہوتی ہے۔ معاشرے کی اخلاقی تربیت اور اصولوں کا اثر سماج کی بنت پر بھی پڑتا ہے۔

اگر ایک معاشرہ اسلامی اقدار، اخلاقی تعلیمات اور پردہ جیسے اصولوں کو اہمیت دیتا ہے تو یہ مرد و عورت دونوں کے لیے ایک اخلاقی اور محفوظ ماحول کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ جنسی جرائم کی شرح میں لباس کا کوئی تعلق نہیں ایک غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہے کیونکہ معاشرے میں لباس شخصیت اور معاشرتی رویوں کی ایک اہم علامت سمجھا جاتا ہے۔ جب سماج میں رہنے والے مرد و عورت مخصوص لباس پہنتے یا مخصوص رویہ اپناتے ہیں تو وہ ایک خاص پیغام دے رہے ہوتے ہیں جو معاشرے میں رہنے والے انسانوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی لباس کو اس لیے اہمیت دی گئی ہے تاکہ مرد و عورت اپنی فطری حیا اور وقار کو محفوظ رکھ سکیں اور ناپسندیدہ رویوں سے بچ سکیں۔

پیمرا، ایچ ای سی اور دیگر انتظامی ادارے اگر اس مسئلے پر توجہ دیں تو سماج میں ایک مثبت تبدیلی جنم لے سکتی ہے۔ خصوصاً میڈیا اور تعلیمی اداروں میں لباس کے اسلامی اصولوں کے حوالے سے ضابطہ اخلاق مرتب کرنا اور اس پر عمل درآمد کروانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ ضابطہ اخلاق صرف ایک انتظامی عمل نہیں بلکہ پورے معاشرے کی اصلاح کے لیے ایک اہم قدم ہے۔

یونیورسٹی سطح پر کیے جانے والے مختلف مطالعات میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ طلبہ و طالبات کی اکثریت مخلوط ماحول اور مرد و خواتین کے غیر مناسب لباس کی وجہ سے تعلیمی ماحول میں سنجیدگی کی کمی محسوس کرتی ہے۔ ۶۵ فیصد طلبہ نے کہا کہ لباس کے حوالے سے واضح اور راہنما اصول ہونے چاہئیں تاکہ تعلیمی ماحول میں غیر ضروری عوامل سے بچا جا سکے۔ آج ہمیں ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جو صرف تعلیم نہ دے بلکہ طلبہ کے اخلاق و کردار کو بھی سنوارے۔ لباس کے اسلامی اصولوں کو اپنانے سے نہ صرف خواتین کی عزت و وقار میں اضافہ ہوگا بلکہ تعلیمی اداروں کا ماحول بھی پاکیزہ اور علم دوست بنے گا۔

مسجدِ اقصیٰ! اے خوابوں کی زمیں
کوئی دنیا میں حسیں تجھ سا نہیں
اس زمیں پر قبلۂ اوّل ہے تو
دہر کی ظلمت میں اک مشعل ہے تو
تو بلاشبہ حاصلِ معراج ہے
اور امت کے لئے منہاج ہے
ہے مقدس سرزمیں سب کے لئے
تو ہے خاتم کا نگیں سب کے لئے
قلبِ مسلم کی رواں دھڑکن ہے تو
جو ہر بے باک کا مدفن ہے تو
مسلم امہ کے لئے تو خواب ہے
دہر میں تیرا بدل نایاب ہے
خون سے تیری سرزمیں لبریز ہے
اب یہ وادی کیا ہے رستاخیز ہے
بہہ رہا ہے تیرے فرزندوں کا خون
بے محابا ہے یہودی کا جنون
سجدہ بندوقوں کے سائے میں یہاں

ہے ستم کا بحرِ بے کراں
ہے ہر اک لب پہ دعا اللہ سے
ہیں مخاطب بے نوا اللہ سے
اس زمیں کو ظلم سے تو پاک کر
ظلم کا پردہ جہاں پہ چاک کر
لاج اب سجدوں کی تیرے ہاتھ ہے
بے نوا ہیں دولتِ ایمان اپنے ساتھ ہے
ظلم سے آزاد اس وادی کو کر
شاد اور آباد اس وادی کو کر
پوری دنیا آئے سجدہ گاہ میں
کوئی مشکل بھی نہ آئے راہ میں
اے خدا اب پوری یہ فریاد ہو
بیتِ اقدس ہر طرح آباد ہو
دانش مضطر کی یہ فریاد سن
اے خدا تو قصۂ بیداد سن

(”فلسطین کی ڈائری“ شائع کردہ ”ختمِ نبوت اکیڈمی، لندن“ طبع فروری ۲۰۲۰ء)

ڈونلڈ ٹرمپ دوبارہ وہائٹ ہاؤس میں

مشرقِ وُسطیٰ اور دنیا پر اس کے متوقع اثرات؟

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

بیس جنوری کو امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ نے دوسری بار صدارتی عہدے کا حلف لے لیا۔ اس بار ان کو امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں میں واضح اکثریت حاصل ہے، اِس طرح وہ دنیا کے سب سے طاقت ور شخص بن کر سامنے آئے ہیں۔ امریکی سپریم کورٹ میں بھی ریپبلکنز کے گہرے اثرات ہوتے ہیں اس لیے وہاں سے بھی ان کے اقدامات کو کلین چٹ ملنے کے پورے امکانات ہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ جیت میں سب سے بڑا فیکٹر جو بائڈن انتظامیہ سے عوام کی ناراضگی تھی جس کو سیاسیات کی زبان میں Anti Incumbency کہتے ہیں۔ عرب نژاد مسلمانوں نے بھی بائڈن کی اسرائیل کے لیے اندھی حمایت سے تنگ آکر اس کو سزا دینے کے لیے ٹرمپ کو ووٹ کیا اور اس غلط فہمی میں کہ ٹرمپ شاید ان کے ووٹوں کی قدر کرتے ہوئے اس معاملہ میں بائڈن سے بہتر ثابت ہوں، چھوٹے شر سے بڑے شر کی طرف چلے گئے۔ کچھ مقامی مصلحتیں بھی رہی ہوں گی۔

امریکی انتخابی تاریخ کے مطابق ریپبلکن ہمیشہ دائیں بازو کے ایوانجلیکل مسیحیوں کی حمایت پاتے رہے ہیں، ان کا مجموعی ووٹ فیصلہ کن انداز میں ریپبلکنز کو ہی پڑتا ہے۔ اور اپنے مذہبی عقائد کے مطابق ایوانجلیکل مسیحی اسرائیل کی تقدیس کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پہلے اسرائیل میں تمام یہودی جمع ہوں گے، دوسرے سولومن ٹیمپل (ہیکل سلیمانی) کو مسجد اقصیٰ کے ملبہ پر بنائیں گے، تبھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمدِ ثانی (Second Coming) کی راہ ہموار ہوگی، جس کے بعد دنیا بھر میں مسیحیوں کا غلبہ ہوگا۔ یہ ان کے عقیدہ کا خلاصہ ہے۔ مسلمان بھی اسی سے ملتا جلتا عقیدہ رکھتے ہیں، اِس فرق کے ساتھ کہ حضرت مسیحؑ کی آمد سے اسلام کا غلبہ ہوگا۔

کل ملا کر سینار یو یہ بن رہا ہے کہ اس وقت بظاہر ڈونلڈ ٹرمپ کے سامنے اپنے شیطانی منصوبوں کو پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ بنیادی طور پر ایک اخلاق باختہ، متواتر جھوٹ بولنے کا عادی، نرگسیت زدہ، سفید فام نسل کے تفوق کا نمائندہ اور صہیونیوں کا پروردہ انسان ہے۔ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں اسکول آف جرنلزم کے ڈین رہ

چکے ٹوم گولڈاسٹائن واشنگٹن پوسٹ کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ ٹرمپ نے اپنی پہلی صدارت کے دوران 30573 جھوٹے یا گمراہ کن بیانات دیے۔ گویا اکیس جھوٹ یومیہ بولے (The Indian Express: Saturday, February 8, 2025)۔ اگر ان اعداد و شمار کو مبالغہ پر مبنی بھی مان لیا جائے تب بھی ٹرمپ کی شخصیت کے ایک نہایت تاریک پہلو کو سامنے لانے کے لیے یہ بالکل کافی ہیں۔

امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ہندوستان کے سفیر رہے سردار نوتیج سرنا کے مطابق ٹرمپ کے کام کرنے کے دو پہلو ہیں: ریالٹی شو ہوسٹ اور ریل اسٹیٹ ڈویلپر۔ داخلی طور پر امریکہ میں اور بیرونی طور پر دنیا خاص کر مشرق وسطیٰ میں اُس کے اقدامات سے اس شخص کے یہی دو پہلو سامنے آرہے ہیں۔

مسلمانوں میں بہت سے دانشور اور صحافی اور تجزیہ کار ٹرمپ سے متعلق بڑی عجیب سی خوش فہمیاں پالے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صدارتی انتخابی میں یہودیوں نے ٹرمپ کو ووٹ نہیں دیا ہے۔ لیکن یہ بات اپنے آپ میں غلط ہے اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو انتخابات سے پہلے سے ہی سفاک اسرائیلی وزیراعظم بنجمن نتن یاہو ٹرمپ کی متوقع صدارت سے کیوں بڑی توقعات وابستہ کیے بیٹھا تھا؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کو معلوم تھا کہ ٹرمپ جیت رہا ہے اور صہیونی لابی کی زبردست حمایت اس کو حاصل ہے اور اس کے بیت ابیض میں آجانے کے بعد ہی دائیں بازو کے اسرائیلیوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ چونکہ وہ اس کے اقتدار کی پہلی باری کے فائدے بٹور چکے تھے۔

ان مسلمان لال بجھکڑوں کی دلیل ہے کہ ٹرمپ بنیادی طور پر اینٹی اسٹیبلشمنٹ ہے، وہ ڈیپ اسٹیٹ سے لڑ رہا ہے وغیرہ۔ ہمارے نزدیک تو یہ دعوا ہی صحیح نہیں۔ یہ تو اپنے اقدامات کو جواز دینے کے لیے متواتر کیا جانے والا ایک پروپیگنڈا ہے جس سے بڑی آسانی سے اختلافی آوازوں کو دبایا جاسکتا ہے۔ ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ ٹرمپ کی فسطائی راہ پر چلنے والے نریندر مودی اس ہتھیار کو کامیابی سے استعمال کرتے آرہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ''چائے والا'' جھولا چھاپ اور ایشور کا اوتار اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں اور اپنے سیاسی مخالفین پر ''شہزادہ'' ہونے کی پھبتی کستے رہتے ہیں۔ حالانکہ تیرہ سال سے Lutyan Delhi (دہلی میں انگریزوں کا آباد کیا ہوا سب سے پوش علاقہ) میں وہ رہتے ہیں۔ ملک کے بڑے بزنس مینوں (جو ہندوتوا کے وفادار ہیں) کی سرپرستی کرتے ہیں۔ غریبوں اور کسانوں کا سب سے زیادہ استحصال کرتے ہیں۔ یہی کام امریکہ میں ٹرمپ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اقتدار میں آتے ہی سب سے پہلے ان لوگوں کی سزائیں معاف کردیں جو ان کے وفادار تھے اور جنہوں نے ٹرمپ کی شکست پر کیپٹل ہل پر احتجاج میں ہلہ بول دیا تھا۔ اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنا دونوں کا من پسند مشغلہ ہے۔ ذرا سا فرق یہ نظر آتا ہے کہ انڈیا میں میڈیا پہلے سے ہی برہمن وادی اور ہندوتوا کا اسیر ہے اور مسلم دشمنی اس کے ڈی این اے میں ہے۔ اس لیے اس نے مودی کو کام کا آدمی سمجھ کر اس کی نازبرداری پہلے ہی دن سے کی ہے۔ امریکہ کا میڈیا لبرل رجحان رکھتا ہے اس لیے اس کو ٹرمپ کے غیر لبرل اقدامات سے پریشانی ہے۔ ٹرمپ بہت بڑا تاجر اور بلینائر ہے بھلا ڈیپ اسٹیٹ کے بغیر اتنا بڑا بزنس مین کیسے چل سکتا ہے؟

ٹرمپ امریکہ کو دوبارہ بڑا بنانے (Make America Great Again) کے نعرہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر اقتدار میں آئے ہیں۔ مودی نے بھی اس کی نقل میں میک انڈیا گریٹ اگین کا احمقانہ نعرہ بلند کر دیا ہے۔ عوام کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے اور وہ پاپولر جذباتی نعروں میں جیتے ہیں۔ ٹرمپ قدیم زمانے کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی ذہنیت رکھتے ہیں، ان کے لیے کسی اخلاقی، سفارتی روایت یا قانون کے کوئی معنی نہیں۔ پرانے زمانہ میں بھی یہی ہوتا تھا کہ نیا نظام پرانے نظام کو اکھاڑ کر اپنے وفادار لوگوں کو ہر جگہ مسلط کرتا تھا چاہے ان میں اس کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ یہی داخلی طور پر امریکہ میں ٹرمپ آج کل کر رہے ہیں، اس کا ڈیپ اسٹیٹ سے ان کی مزعومہ لڑائی کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو بس اتنا کہ پرانی بیوروکریسی اور ڈیپ اسٹیٹ کو ہٹا کر اس کی جگہ نئی اور اپنی وفادار ڈیپ اسٹیٹ ملک پر مسلط کر رہے ہیں۔ کیونکہ نرگسیت زدہ لوگ پہلے سے بنے بنائے قوانین، سول اداروں اور مہذب روایات یا اخلاقیات کی کوئی پروا نہیں کیا کرتے۔ ٹرمپ نے بھی عہدے کا حلف لیتے ہی تابڑ توڑ ایسے ہی اقدامات شروع کر دیے ہیں جن سے لگے کہ وہ "روایت" کے مخالف ہیں۔ وہ اپنے غیر روایتی کاموں کو انجام دینے کے لیے جتنی جلدی میں ہیں اس سے لگتا ہے کہ آخری تجزیہ میں وہ امریکہ کو دنیا میں نکو بنا کر چھوڑیں گے۔

یوروپ جس کو وہ اپنی اکانومی کے لیے پہلے سے بوجھ سمجھتے ہیں ان پر ٹیرف لگا دیے ہیں، ناٹو کے معاشی اخراجات (جس کا بڑا حصہ امریکہ اٹھاتا تھا) وہ کم کر دیے ہیں۔ اپنا فوجی بجٹ بھی کم کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ روس سے بھی یوکرین کے معاملہ میں ایک ڈیل کر کے معاملہ کو رفع دفع کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ چین سے بھی کوئی ڈیل کر لیں۔ گویا ان کے کام کرنے کا انداز (Modus Operandi) یہ ہے کہ بڑی طاقتوں سے پنگا نہ لے کر چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کر لیا جائے۔ چنانچہ پانامہ کنال، کناڈا پر بری نظر ڈالنے کے علاوہ غزہ میں تفریحی مقام (Reveria) بنانے کا شیطانی منصوبہ اسی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

صدر ٹرمپ کی ٹیم کے خاص لوگ یہ ہیں: نائب صدر جے ڈی وینس، سیکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر خارجہ) مارکو روبیو، ڈیفنس سیکریٹری ہیٹ بیگ سیتھ، مشرقِ وسطیٰ کے لیے خاص نمائندہ مارکوس ہوکسٹائن، اسرائیل میں امریکی سفیر ہکابی مائکے، دنیا کا سب سے امیر شخص ایلون مسک، انڈین نژاد تلسی گبارڈ جو مسلم مخالف کمنٹ کرتی رہی ہے اور ہندوتوا لابی سے اس کے رشتے ڈھکے چھپے نہیں یہاں تک کہ آر ایس ایس کے بڑے بڑے ذمہ دار اس کی قصیدہ خانی کر رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ۲۲ فروری 2025ء کے انڈین ایکسپریس میں رام مادھو کا مضمون: Rise and rise of Tulsi Gabbard)

گبارڈ کو چھوڑ کر یہ سب کے سب یہودی یا اعلانیہ صہیونی ہیں۔ سابق صدر جو بائڈن اور اس کی انتظامیہ جھوٹوں کو ہی فلسطین کا نام لے لیا کرتی تھی مگر اِن لوگوں کے لیے فلسطین کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ غزہ میں سیز فائر کا ڈرامہ سراسر ایک اسٹریٹیجک گیم ہے جس کے تحت تمام اسرائیلی مغویوں کو رہا کروا لیا جائے گا، اس کے بعد اسرائیل کو کھلی چھوٹ دی جائے

گی کہ وہ غزہ سے جبراً تمام فلسطینیوں کو باہر نکال دے اور پھر وہاں ٹرمپ اپنے ڈویلپرز بھیجے گا۔ یوں اسرائیل کو ہمیشہ کے لیے فلسطین کے کابوس سے نجات مل جائے گی۔ نتن یاہو کو اتنی جلدی ہے کہ وہ اب بھی مختلف حیلوں بہانوں سے سیز فائر سے نکل جانا چاہتا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اور بنجمن نتن یاہو کے درمیان یہی طے پا چکا ہے۔

باقی رہے عرب حکمراں وہ تھوڑا بہت شور مچائیں گے اس کے بعد قسمت کا لکھا اور مجبوری کا سودا سمجھ کر اس کو قبول کر لیں گے۔ رہا انٹرنیشنل لا اور اقوام متحدہ اور نام نہاد عالمی برادری تو اسرائیل امریکی آشیرباد سے ہمیشہ ان سب کو جوتے کی نوک پر رکھتا آیا ہے، اب وہ کون سا اُس کا کچھ بگاڑ لیں گے!

مارکو روبیو نے ابھی حال ہی میں خطہ کا دورہ کیا، وہ سب سے پہلے اسرائیل گیا، پریس کانفرنس کے دوران بنجمن نتن یاہو اس سے بار بار معانقہ کرتا رہا۔ روبیون نے غزہ سے متعلق ٹرمپ کے پلان کو بولڈ بتایا، اُس کی خبثِ نیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس پریس کانفرنس میں مسلسل ایران کے خلاف بولتا رہا اور اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ مشرق وسطیٰ میں ایک دو اسرائیل اور ہو جائیں تو پورے خطہ میں امن ہی امن آجائے۔ وہ اسرائیل جس نے پچاس ہزار بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو مار دیا! عربوں کے منہ پر اس سے بڑا تماچا اور کیا ہوگا؟

ٹرمپ کے صدارت کا حلف لیتے ہی سب سے پہلا ملک جس کے سربراہ کا وہائٹ ہاؤس نے پُرتپاک خیر مقدم کیا وہ اسرائیل تھا۔ نتن یاہو پہلے سے ہی ٹرمپ سے بڑی توقعات لگائے بیٹھا تھا۔ چنانچہ ٹرمپ اور اس کی انتظامیہ کے سبھی لوگ بڑے فخر سے اس کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ امریکہ میں ان سے پہلے اسرائیل کا اتنا بڑا خیر خواہ اور دوست اور کوئی نہیں آیا۔ بائڈن نے 2000 پاؤنڈ کے جن بموں کی سپلائی روک دی تھی وہ ٹرمپ نے فوراً جاری کر دی۔ اسرائیل چاہتا ہے کہ ٹرمپ کے اقتدار سے وہ جتنے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ جلدی حاصل کر لے۔ چنانچہ اس کا سارا زور اس پر ہے کہ ایران کے نیوکلرری ایکٹر کو برباد کر دینے کی امریکہ اسے اجازت دے دے۔ تاہم تجزیہ کار نجم سیٹھی کہتے ہیں کہ

> "غالباً ٹرمپ ابھی اس حد تک جانا نہیں چاہے گا کیونکہ اِس پر اگرچہ بہت کم بات ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خود امریکہ کی اکانومی اب بہت مضبوط نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی آمدن کے برابر ہی اس کے بیرونی مصارف ہو گئے ہیں جن کو ٹرمپ کم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ معاملات میں ڈیل کرے گا، دھمکیاں دے گا مگر معاملات وہ مذاکرات کی میز پر ہی طے کرنا چاہے گا۔"

اس تجزیہ میں دم لگتا ہے کیونکہ ٹرمپ کی اعلان کردہ پالیسی America First کی ہے اور وہ اس نظریہ کا قائل ہے کہ ہم نے دنیا بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے، جو چیز امریکہ کے مفاد میں ہوگی وہ ہم کریں گے دوسرے جائیں بھاڑ میں۔ بیرونی دنیا میں امریکی مداخلت اور اس کے مصارف کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ اس کی معیشت اس کا بوجھ سہار نہیں پا رہی ہے۔ ماہرین معیشت کا خدشہ ہے کہ اگر کسی بھی طرح امریکی ڈالر کی قیمت نیچے گری تو وہ اس کی معیشت کو گہرا زخم لگائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرمپ جی ٹونٹی یا برکس جیسے معاشی گروپ کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو اس کی نظر میں ڈالر کو چیلنج دے

گا۔

ٹرمپ کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف سے خود ہی الٹے سیدھے بیان دے کر ان کو دباؤ میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ اُس نے بار بار کہا کہ سعودی عرب اسرائیل کے ساتھ معاہدہ کے لیے تیار ہے اور سعودیوں سے بات ہو چکی ہے۔ اب سعودیہ بے چارہ لاکھ اس کی تردید کرے اور صفائیاں دے مگر ٹرمپ کا حربہ اپنا کام کر چکا ہے۔ آج عربوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بھی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو سعودی عرب کی کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ابھی حال ہی میں ٹرمپ نے یہی کھیل اردن کے بادشاہ عبد اللہ دوم کے ساتھ بھی کھیلا۔ اُس غریب کو دھمکانے اور اپنا پلان بتانے کے لیے وہائٹ ہاؤس طلب کیا گیا۔ اپنی انگریزی دانی کے بل بوتے پر کنگ عبد اللہ کو بھروسہ رہا ہوگا کہ وہ ٹرمپ کو قائل کرنے کی کوشش کر لیں گے کہ ان کے منصوبہ سے پورے خطہ میں جو پہلے ہی فلیش پوائنٹ بنا ہوا ہے مزید آگ لگ سکتی ہے۔ لیکن ٹرمپ نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ مختصر وقت میں اپنی بات کر کے پریس بریفنگ کے لیے اٹھ گیا اور پریس کے لوگوں کے سامنے روایتی طور پر کنگ کی تعریف کر کے اپنا پلان دہرا دیا کہ ہم مصر اور اردن کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں ان کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ یاد رہے کہ اردن کو خاصی امریکی امداد ملتی ہے اور مصر کو تو دنیا میں اسرائیل کے بعد شاید سب سے زیادہ۔ پریس بریفنگ میں غریب کنگ کے چہرہ پر ہوائیاں اڑتی رہیں اور بہت مشکل سے اتنا کہہ پایا کہ ہماری بات چیت مثبت رہی اور سعودی عرب اور مصر بھی غزہ کی آباد کاری کا ایک پلان بنا رہے ہیں ان کو بھی ہمیں سننا چاہیے اور مل جل کر مسئلہ کا ایسا حل نکالا جانا چاہیے جس میں سب کا فائدہ ہو۔ البتہ لوٹنے کے بعد اس نے ایکس (سابق ٹویٹر) کے پلیٹ فارم سے اپنی بات رکھی اور ٹرمپ کے پلان پر تنقید کی۔

مصری صدر کو بھی امریکہ کا دورہ کرنا تھا مگر اس موقع پر اس نے دانشمندی دکھائی اور اپنا دورہ کینسل کر کے وہ مشترکہ عرب منصوبے کے لیے حمایت جٹانے کے لیے دوسرے ملکوں کے دورہ پر نکل گیا۔ عرب حکمرانوں کو شاید یہ امید نہیں تھی کہ امریکہ میں ٹرمپ اتنی طاقت کے ساتھ دوبارہ اقتدار میں آجائے گا اور آتے ہی خطہ میں طاقت کا سارا توازن اسرائیل کے حق میں ڈال دے گا۔

غزہ کے لوگوں نے بے مثال صبر و پامردی کا مظاہرہ کر کے اسرائیل کو شرمسار تو کر دیا مگر اصل کھیل تو اب ہو رہا ہے۔ جس میں خدشہ یہ ہے کہ خاکم بدہن غزہ کو چھوڑنے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں ہو گا! سعودی عرب، مصر، اردن اور متحدہ عرب امارات بظاہر ابھی تک ٹرمپ کے پلان کی مخالفت کر رہے ہیں، انہوں نے چار مارچ کو عرب لیگ کی میٹنگ بلائی ہے، اس کے بعد ہو سکتا ہے جلد ہی او آئی سی کا اجلاس بھی طلب کیا جائے۔

عرب ممالک کا غزہ پر پندرہ مہینے سے مسلط کردہ جنگ کے دوران اس کے تئیں، فلسطینیوں کے تئیں اور خاص کر حماس کے ساتھ جو دشمنانہ رویہ سامنے آیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے نہیں لگتا کہ عرب ممالک کچھ خاص کر پائیں گے۔ بھلا جو

حکمراں عین اُس وقت جب غزہ میں قتلِ عام جاری ہو موسم الریاض کی ناچ رنگ کی محفلوں میں لگے رہیں، جو عین اسی دوران جینیفر لوپیز کے عریاں کنسرٹ منعقد کرانے کی شقاوت دکھاجائیں، جو اپنا "شکیرا" نہ رکنے دیں، اُن سے کوئی اچھی امید کی جاسکتی ہے!

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا!

اس شیخ حرم سے کوئی کیا امید کرلے اور کیوں کر کرلے! سعودی عرب اور اسرائیل میں لفظی جنگ بھی چھڑ گئی ہے۔ ٹرمپ اور اس کی انتظامیہ کے بیانات ہی سونے پر سہاگہ تھے کہ وہائٹ ہاؤس کی آشیرباد کے بعد اپنے آپے سے باہر نتن یاہو نے ایک انٹرویو میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر سعودی عرب کو لگتا ہے کہ فلسطینیوں کو الگ ملک ملنا چاہیے تو سعودی عرب کے پاس بڑا رقبہ ہے وہ اس میں ان کے لیے الگ ملک بنادے۔ یہ سعودی عرب کی سالمیت پر حملہ تھا، اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ فوراً سعودی وزیر خارجہ فیصل بن فرحان باہر آئے اور صحافیوں سے کہا These are the words of an occupying mindset (یہ قبضہ کرنے والی ذہنیت کے الفاظ ہیں)۔ سعودی عرب میں سارا پریس اور میڈیا بادشاہت کا غلام ہے، فوراً ہی سب کا لہجہ بدل گیا۔

اب سے چند برس پہلے تک عرب میڈیا میں گویا ایک اجماع تھا اور سب اسرائیل کو العدو الصہیونی (صہیونی دشمن) کہتے تھے۔ مگر چند سال سے سعودی میڈیا کے لب ولہجہ میں فرق آگیا تھا اور نتن یاہو کے لیے وزیر اعظم اسرائیل کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ حماس کو ارہابي (دہشت گرد) کہتا تھا۔ اتنا ہی نہیں اسماعیل ہنیہ کی شہادت پر تو روزنامہ المدینہ نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن بادشاہ کے تیور بدلے تو سب کے لہجے بدل گئے، چنانچہ عکاظ، الریاض اور المدینہ تینوں بڑے اخبارات میں اب کیان الاحتلال الاسرائیلی (اسرائیلی قبضہ گیر ریاست) کے لفظ کا استعمال شروع ہوگیا۔ نتن یاہو کے نام سے رئیس الوزراء کا نام غائب ہوگیا۔ تینوں کو فلسطینیوں کے حقوق یاد آگئے۔ ایک سعودی بلاگر نے آگے بڑھ کر اس بات کی وکالت بھی کی کہ سعودی عرب کو حماس اور اخوان پر سے حج وعمرہ پر پابندی اٹھالینی چاہیے۔

سفیر نوتیج سرنا کہتے ہیں کہ

> "ٹرمپ نے بنجمن نتن یاہو کو اپنی بغل میں کھڑا کرکے پریس کے سامنے کہا تھا کہ وہ مغربی کنارہ کو اسرائیل میں ضم کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں، ان کے یہ اقدامات انسانیت کے خلاف ہیں۔ یہ اقدامات اسرائیلی دائیں بازو کی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ ان بیانات سے مسئلہ کے دو ریاستی حل کے امکانات معدوم ہو رہے ہیں۔ ٹرمپ اور ان کی ٹیم ایران کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کل کو یہ کسی بھی دوسرے ملک کے لیے نظیر بن جائے گی۔ کوئی بڑا ملک چھوٹے ملک پر جارحیت کرے گا تو آپ اس کو کس طرح روک سکیں گے۔"

اکیس فروری کو جی سی سی کے ممالک کا ریاض سعودی عرب میں اجلاس ہوا جس میں مصری صدر عبد الفتاح السیسی نے غزہ کی تعمیرِ نو کا اپنا پلان پیش کیا جس پر تمام عرب ممالک کا اتفاق ہو گیا ہے۔ اس پلان کے مطابق غزہ کی تعمیرِ نو کے لیے بڑی رقمیں یہی ممالک ادا کریں گے اور ورلڈ کمیونیٹی سے بھی اس میں تعاون کی اپیل کی جائے گی۔ فلسطینیوں کی کوئی بے دخلی نہیں ہوگی اور غزہ میں نئی انتظامیہ لائی جائے گی جس میں حماس شامل نہ ہوگی۔

عربوں کے اس متحدہ اعلامیہ کا فوری اثر دیکھا گیا کہ فوکس نیوز کو ریڈیو انٹرویو دیتے ہوئے ڈونلڈ ٹرمپ نے حیرت کا اظہار کیا کہ اردن اور مصر نے ان کے پلان سے اتفاق نہیں کیا۔ دوسرے انہوں نے کہا کہ وہ اب بھی اپنے پلان کے نفاذ کی سفارش کریں گے تاہم وہ اس کو impose نہیں کریں گے اور جبراً نہیں تھوپیں گے۔ خدا کرے یہ سچ ہو اور عرب ممالک اتحاد کے ساتھ اپنے اس منصوبہ پر آگے بڑھ سکیں اور دو ریاستی حل کی طرف کوئی پیش قدمی ممکن ہو سکے۔

فلسطین کی جنگ بندی اور پیکا ایکٹ کی منظوری

31 جنوری 2025ء کو گوجرانوالہ میں پریس کانفرنس سے خطاب

مولانا فضل الرحمٰن

منجانب › حافظ نصر الدین خان عمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

پوری دنیا جانتی ہے کہ پندرہ ماہ تک اسرائیل اور صہیونی قوت غزہ اور فلسطین کے مسلمانوں پر جو آگ برساتی رہی ہے اور جس سے کہ ساری کی ساری آبادیاں منہدم ہوگئیں، پچاس ہزار سے زیادہ لوگ شہید ہوئے، جس میں چھوٹے بچے، خواتین، بوڑھے۔ اور اب جو جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ہے وہ چونکہ فلسطینیوں کی شرائط پہ ہوا ہے اور اس میں ان کو کامیابی ملی ہے تو یقیناً وہ مبارکباد کے بھی مستحق ہیں، اور ہمیں اللہ پر مکمل بھروسہ ہے کہ فلسطینیوں کا یہ خون اور یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور یہ ساری جدوجہد فلسطین کی مکمل آزادی اور مسجد اقصیٰ کی مکمل آزادی پر منتج ہوگی۔

لیکن یہاں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکی صدر ٹرمپ نے کہا ہے کہ فلسطینیوں کو مصر میں آباد کر دیا جائے، تو فلاں ملک میں آباد کیا جائے، تو فلاں ملک میں آباد کیا جائے۔ ٹرمپ جیسی شخصیت کے ساتھ اسی طرح کی باتیں جچتی ہیں جس کا عقل کوئی تقاضا نہ کرتی ہو۔

بنیادی بات یہ ہے کہ جنگِ عظیم اول کے بعد جب یورپ میں یہودیوں نے مار کھائی اور وہ دربدر ہوئے تو اس وقت بین الاقوامی جو قوانین سامنے آئے اقوام متحدہ کے۔ اور ان کی نئی آبادکاری کے بارے میں ایک بین الاقوامی ذمہ داری قرار دی گئی تھی کہ ان لوگوں کو پوری دنیا میں جگہ جگہ آباد کیا جائے۔ پھر کیوں صرف فلسطین میں آباد کیا گیا؟ صرف فلسطین کی سرزمین کیوں اس کے لیے خاص کر دی گئی؟ اور ۱۹۱۷ء میں جو دار فور معاہدہ تھا وہ کس منصوبے کے تحت ہوا جس میں کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی نفی کی گئی؟ تو اس حوالہ سے ہم یہ سوچتے ہیں کہ آپ فلسطینیوں کو مختلف ممالک میں آباد کرنے کا مشورہ نہ دیں۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ آپ اسرائیل میں جتنے یہودی اور صہیونی لوگ ہیں ان کو امریکہ میں آباد کر لیں یا کسی بھی یورپی ملک میں آباد کر لیں۔ اور یہ بین الاقوامی ذمہ داری کے تحت اس وقت سب سے بڑی ذمہ داری امریکہ پر ہے کہ وہ اسرائیل

کو یہاں سے اٹھائے اور تمام یہودیوں کو اور صہیونیوں کو امریکہ میں جگہ دے اور وہاں ان کو آباد کر دے۔

دوسری بات جو میں آپ حضرات کے سامنے کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی جو نیا قانون پیکا (PECA) پاس ہوا ہے، تو میں ذرا آپ کے نوٹس میں یہ بات لے آؤں کہ اسلام آباد میں آپ کا ایک وفد مجھے ملا تھا اور ان کا موقف میں نے سنا اور ان کے ساتھ میں نے مذاکرہ بھی کیا اور اس کے فائدے اور نقصانات کے پہلوؤں پر بحث بھی کی۔ مجھے ان کی بات میں وزن نظر آیا اور ان کی بات معقول تھی کہ یکطرفہ طور پر قانون پاس کرنے کی بجائے اگر صحافیوں کے ساتھ ذرا مشورہ کر لیا جاتا اور ہماری کچھ تجاویز اس میں لے لی جاتیں تو کیا بری بات تھی؟ اور اس میں تو یہ ہے کہ ایسا قانون کہ جب چاہے جس کو چاہے جس وقت اٹھا لیں۔ اور ہر ہمارا ایک بیان، اس کو آپ اس زمرے میں فوراً لے آئیں، کون پوچھنے والا ہے، اس کی کوئی تشریح تو ہے نہیں۔

تو اس اعتبار سے میں نے صدر مملکت سے فون پر رابطہ کیا۔ اور میں نے ان سے کہا کہ آپ دستخط نہ کریں اور ان کے ساتھ آپ رابطہ کر کے ان کی تجاویز لے لیں ان سے۔ مجھ سے انہوں نے اتفاق کیا، اور یہ بھی کہا کہ محسن نقوی صاحب اب پہنچے ہیں، اور ایک آدھ دن میں میرے پاس پہنچنے والے ہیں۔ میں ان کی ذمہ داری لگاتا ہوں کہ وہ صحافیوں کے ساتھ رابطے میں آجائیں اور پھر ان کی کچھ جو تجاویز ہوں گی وہی میں پھر گورنمنٹ کو بھیج دوں گا کہ اس میں آپ شامل کر لیں۔

لیکن صبح ہوتے ہی دیکھا کہ انہوں نے دستخط بھی کر دیے۔ اب اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ انداز کہ آپ ایک شریف آدمی کے طور پر صدر مملکت کی حیثیت سے ایک بات کر لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد آپ اس پر دستخط کر کے اس کو گزٹ کر لیتے ہیں۔ تو میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ صحافیوں کی اس میں تجاویز لی جائیں، ان سے بات چیت کی جائے، جو معقول تجاویز ہوں ان کو قبول کر لیا جائے، اور ترمیم کے ذریعے سے اس کو اس قانون کا حصہ بنا دیا جائے۔

تو یہ دو باتیں اس وقت میرا خیال تھا کہ میں آپ کے گوش گزار کر لوں۔

(31 جنوری 2025ء کو گوجرانوالہ میں پریس کانفرنس سے خطاب)

facebook.com/MoulanaOfficial

قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب (امیرِ مرکزیہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان) مفکر اسلام حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب اور مہتمم جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالا، حضرت مولانا محمد فیاض خان سواتی صاحب کی دعوت پر جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالا کی سالانہ تقریب دستارِ فضیلت میں بطورِ مہمانِ خصوصی 31 جنوری 2025ء بروز جمعۃ المبارک گوجرانوالا تشریف لائے۔ جامعہ کی سالانہ تقریب برائے دستارِ فضیلت جمعہ کے دن منعقد ہوتی ہے، لہٰذا حضرت قائدِ جمعیۃ سے جمعۃ المبارک کے خطاب کی درخواست کی گئی۔ تاریخی جامع مسجد نور میں حضرت قائدِ جمعیۃ نمازِ جمعہ سے قبل تشریف لے آئے اور تقریباً پون گھنٹہ علمی و فکری خطاب فرمایا۔

حضرت قائدِ جمعیۃ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے خطاب میں علم اور علماء کے مقام اور ان کے فرائض پر قرآن کریم کی روشنی میں فاضلانہ گفتگو فرمائی۔ جامعہ نصرۃ العلوم، اکابرِ جامعہ امام اہل سنہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر، مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی رحمہما اللہ، شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی صاحب اور مہتمم جامعہ مولانا محمد فیاض خان سواتی صاحب کا بطورِ خاص تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ نصرۃ العلوم اور اس کے اکابر سے میرا بچپن سے فکری اور روحانی تعلق ہے اور ان شاء اللہ یہ تعلق ہمیشہ رہے گا۔

انہوں نے جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے والے فضلاء کو عملی میدان میں نصائح کرتے ہوئے بطورِ خاص اپنے شیخ اور استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ نصیحت بیان فرمائی کہ آٹھ دس سال پڑھنے کے بعد تم عالم نہیں بنے ہو، بلکہ تمہارے اندر اب عالم بننے کی استعداد پیدا ہو گئی ہے لہٰذا اب تم مزید مطالعہ اور تحقیق کر کے عالم بن سکتے ہو۔

قائدِ جمعیۃ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جمعیۃ علماء اسلام کا پروگرام اور نظریہ قرآن سے ماخوذ ہے کیونکہ قرآن ہمیں آزادی و حریت، استحکامِ معیشت اور مفلوک الحالی کے خاتمے کی جدوجہد کی دعوت دیتا ہے اور یہی دعوت

جمعیۃ علماء اسلام کے پروگرام اور منشور کا حصہ ہے۔

جمعہ کے خطاب کے بعد مہتمم جامعہ حضرت مولانا محمد فیاض خان سواتی صاحب نے خطبہ ارشاد فرمایا اور قائدِ جمعیۃ مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے امامت کی درخواست کی۔ اس موقع پر ہزاروں افراد اور علماء کرام نے قائدِ جمعیۃ کی امامت میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔

نمازِ جمعہ کے بعد قائدِ جمعیۃ جامعہ کے مہمان خانہ میں تشریف لے گئے۔ اس دوران راقم (خرم) سمیت اہم ذمہ داران کو حضرت قائدِ محترم سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ اس موقع پر حضرت مہتمم صاحب اور اُن کے صاحبزادہ حافظ خزیمہ خان سواتی بھی موجود تھے۔ حافظ خزیمہ سواتی نے قائدِ جمعیۃ کو اپنا ایم۔ فل کا مقالہ پیش کیا جو ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالا میں "افکارِ شاہ ولی اللہ" کے عنوان سے خاص نمبر کے طور پر شائع ہوا ہے۔ قائدِ جمعیۃ نے مقالہ ملاحظہ کیا اور بڑی خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنی دعاؤں سے نوازا۔

اسی دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم بھی تشریف لے آئے۔ قائد جمعیۃ کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا، حضرت زاہد الراشدی صاحب کو دیکھتے ہی چائے کا کپ نیچے رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے اور پر تپاک انداز سے گلے لگ کر ملے۔ کچھ دیر دونوں بزرگوں میں گفتگو کا تبادلۂ خیال ہوا اس موقع پر مجلسِ خاص میں راقم سمیت حاجی بابر رضوان باجوہ، قائد محترم کے سیکرٹری جناب طارق بلوچ بھی موجود تھے۔ بعد میں حضرت شیخ الحدیث صاحب نے درخواست کی کہ طلباء کرام نے اپنے سروں پر پگڑیاں باندھ لی ہیں، اب آپ ان کے سروں پر دستِ شفقت رکھ دیں۔ لہٰذا قائدِ جمعیۃ دوبارہ اسٹیج پر تشریف لائے اور طلباء کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کے سروں پر دستِ شفقت رکھا۔

قائدِ جمعیۃ کی موجودگی میں شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی صاحب نے بھی مختصر خطاب فرمایا اور ان کی آمد پر شکریہ ادا کیا۔ جبکہ جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل استاد حضرت مولانا فضل الہادی صاحب نے قائد جمعیۃ کی خدمت میں منظومہ (سپاس نامہ) پیش کیا اور جامعہ کے متعلم یحییٰ زکریا صاحب نے عربی کلام پڑھ کر سنایا۔

تقریب ابھی جاری تھی کہ قائدِ جمعیۃ نے جامعہ کے منتظمین سے رخصت چاہی اور جمعیۃ علماء اسلام گوجرانوالا کے رہنما حاجی محمد شاہ زمان کے گھر تشریف لے گئے جہاں پریس کانفرنس کی اور میڈیا سے عالمی سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کی۔

نمازِ عصر کے بعد قائدِ جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اپنے دیرینہ بزرگ اور جمعیۃ علماء اسلام گوجرانوالا کی شان حضرت مولانا سید عبد المالک شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے سے ملاقات کے لیے جامع مسجد حاجی مراد، تشریف لے گئے، فرزندانِ گرامی سید حفیظ الرحمٰن شاہ، مولانا سید فضل الرحمٰن شاہ اور سید اسد شاہ نے قائدِ جمعیۃ کا استقبال کیا۔ جماعتی کارکنان بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نمازِ مغرب قائدِ محترم کی امامت میں ادا کرنے کی سعادت ہوئی۔ اور نماز

کے بعد قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گوجرانوالا شہر میں پورا دن گزارنے کے بعد لاہور تشریف لے گئے۔

جماعتی کارکنان بالخصوص چوہدری بابر رضوان باجوہ، مولانا حافظ احمد اللہ گورمانی، پیر قاری سمیع الحق، سید حفیظ الرحمٰن شاہ، حافظ خرم شہزاد (امیر تحصیل کامونکی)، حافظ فضل الرحمٰن (امیر سٹی گوجرانوالا)، حافظ زاہد اللہ خان، حافظ فاروق گادی (امیر نوشہرہ ورکاں)، حافظ فضل اللہ گورمانی، چوہدری اکمل گجر، حافظ عبد الجبار، حافظ امجد محمود معاویہ، مولانا پیر محمد ریاض اور دیگر احباب نے قائدِ جمعیۃ کو گوجرانوالا سے رخصت کیا جبکہ قائد جمعیۃ کی آمد سے کئی دن پہلے سے مختلف امور اور انتظامات میں جمعیۃ علماء اسلام سٹی، تحصیل کامونکی اور تحصیل نوشہرہ ورکاں کے عہدیدار مستعد اور مصروف تھے۔

جامعہ نصرۃ العلوم میں قائد جمعیۃ کی سیکورٹی کے انتظامات جمعیۃ علماء اسلام ضلع گوجرانوالا کے سینئر راہنما جناب حاجی بابر رضوان باجوہ کی مشاورت اور نگرانی میں حضرت مولانا محمد فیاض خان سواتی صاحب نے مرتب کیے۔

قائدِ جمعیۃ کے دورۂ گوجرانوالا سے مخلص اور نظریاتی کارکنوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص نصیب فرمائے، جماعت کے ساتھ مخلص بنائے اور قائد جمعیۃ کے دورۂ گوجرانوالا کے نتائج کو دور رس بنائے۔ آمین یارب العالمین

پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ نے مولانا عبد الرؤف فاروقی کو آئندہ پانچ سال کے لئے کونسل کا مرکزی سیکرٹری جنرل منتخب کیا ہے اور رمضان المبارک کے بعد مرکزی نظام شریعت کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں دستور کی منظوری دی جائے گی اور مرکزی مجلس شوریٰ اور عہدیداروں کا چناؤ مکمل کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ آج راولپنڈی میں امیر مرکزیہ مولانا زاہد الراشدی کی زیر صدارت منعقدہ مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں کیا گیا۔ اجلاس میں مولانا مفتی محمد رویس خان ایوبی اور مولانا عبد القیوم حقانی کو پاکستان شریعت کونسل کا سرپرست چنا گیا اور مولانا عبد الرؤف محمدی کو ڈپٹی سیکرٹری جنرل، مولانا شبیر احمد کشمیری کو رابطہ سیکرٹری، پروفیسر منیر احمد کو سیکرٹری اطلاعات، مفتی محمد سعد سعدی کو ڈپٹی سیکرٹری اطلاعات منتخب کیا گیا، جبکہ باقی عہدہ داروں کا چناؤ مرکزی کنونشن میں کیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اجلاس کے فیصلوں اور دیگر تفصیلات کی رپورٹ مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی طرف سے کل جاری کی جائے گی۔

(۲۴ فروری ۲۰۲۵ء)

ممتاز دینی شخصیت مولانا عبد الرؤف فاروقی کو پاکستان شریعت کونسل کا سیکرٹری جنرل، مولانا عبد الرؤف محمدی کو ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔ مفتی اعظم آزاد کشمیر مفتی محمد رویس خان ایوبی اور شیخ الحدیث مولانا عبد القیوم حقانی سرپرست، پروفیسر حافظ منیر احمد سیکرٹری اطلاعات، مولانا شبیر احمد کاشمیری مرکزی رابطہ سیکرٹری، مفتی محمد سعد سعدی ڈپٹی سیکرٹری اطلاعات اور سابق سیشن جج چوہدری خالد محمود ایڈووکیٹ قانونی مشیر ہوں گے، جبکہ ممتاز دینی رہنما مولانا عبد الحسیب خوستی کو شریعت کونسل بلوچستان کا امیر نامزد کر دیا گیا۔ یہ انتخاب ۲۵ فروری کو اسلام آباد میں پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں عمل میں لایا گیا۔

اجلاس میں فیصل آباد سے مولانا عبد الرزاق، کراچی سے مولانا رشید احمد درخواستی، مولانا قاری اللہ داد، کہوٹہ سے مولانا محمد امین، اسلام آباد سے مولانا رمضان علوی، حافظ علی محی الدین، سعید احمد اعوان، ٹیکسلا سے حاجی صلاح الدین

فاروقی، پنجاب سے مفتی محمد نعمان، مولانا قاری عثمان رمضان، خیبر پختونخوا سے مولانا عبد الحفیظ محمدی، مفتی جعفر طیار مقبول اعوان، گلگت بلتستان سے مولانا ثناء اللہ غالب، مری سے مولانا قاسم عباسی کو مرکزی شوریٰ کا ممبر منتخب کر لیا گیا، جبکہ سابق سیشن جج چوہدری خالد محمود ایڈووکیٹ کی سربراہی میں ایک قانونی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس کے رکن ذوالفقار گل عباسی ایڈووکیٹ اور مولانا وجیہ اللہ ایڈووکیٹ رکن ہوں گے۔

اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ عید الفطر کے بعد اسلام آباد میں منعقد ہونے والے بڑے کنونشن کے موقع پر دیگر عہدیداروں کا اعلان کیا جائے گا، اس موقع پر مولانا شبیر احمد کاشمیری کو آزاد کشمیر میں جبکہ مولانا عبد الحسیب خوستی کو بلوچستان میں تنظیم سازی کا ٹاسک بھی دیا گیا۔ اجلاس میں کونسل کے دستور کے حوالے سے بھی بحث کی گئی اور بعض شقوں کو حتمی شکل دی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ نظام شریعت کنونشن میں ترمیم شدہ دستور کو بھی حتمی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔

(۲۵ فروری ۲۰۲۵ء)

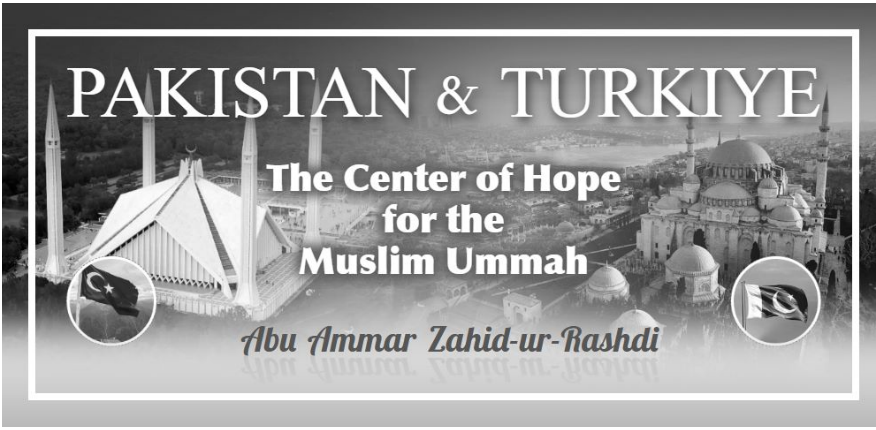

According to a report published in the media on February 14th, Turkish President Recep Tayyip Erdoğan, while addressing an event at the Prime Minister House in Islamabad, stated that Quaid-e-Azam and Allama Iqbal are our heroes also, and that Allama Iqbal's poetry sparked a revolution throughout the world. He emphasized that helping Palestinians is our duty and that our efforts will continue until an independent Palestinian state is established. He stressed the need to resolve the Kashmir conflict through dialogue and in accordance with UN resolutions. He expressed his happiness in visiting Pakistan, stating that it is our second home.

The visit and activities of the President of Turkey, Mr. Hafiz Recep Tayyip Erdoğan, to Pakistan are both welcome and encouraging for us. At this critical juncture in our nation's history, our friends are not only concerned about us but are also cooperating to help us overcome this crisis. The details of the agreements reached between the rulers of Turkey and Pakistan will gradually come to light, but just this fact is reassuring enough for us that President Erdoğan has visited Pakistan at this stage. The gathering of friends itself is significant, as the remaining matters naturally progress. We are confident that these discussions will yield far-reaching results, leading to further improvements in the internal affairs of Turkey and the Islamic Republic of Pakistan. Additionally, we hope that these discussions will pave the way for the fulfillment of the expectations that the Islamic world and the Muslim Ummah have placed on these two nations.

A century ago, Turkey, under the title of the Ottoman Caliphate, held the position of leadership and representation of the Muslim Ummah for nearly

four centuries. Nations experience ups and downs in their lives, and the Ottoman Caliphate also went through such phases several times. Even during its decline, it maintained this status, which was acknowledged by former Pakistani Prime Minister, the late Benazir Bhutto, during an interview amidst the severe crisis in Bosnia and Serbia. She stated: "There isn't even an Ottoman Empire now to whom we can express our sorrows."

The emotional attachment of the Muslims of the subcontinent to the Ottoman Caliphate can be gauged from the fact that a century ago, when the conspiracies and activities of European countries to dismantle the Ottoman Caliphate were at their peak, the Muslims of the subcontinent, under the leadership of Maulana Muhammad Ali Jauhar, took to the streets from Peshawar to Calcutta. When Maulana Muhammad Ali Jauhar was arrested and imprisoned, his esteemed mother stepped into the field, and her slogan echoed in the streets of Pakistan, India, and Bangladesh: "Says the mother of Muhammad Ali, sacrifice your life for the Caliphate."

These emotions and feelings of the Muslims of the subcontinent were not merely for Turkey but for the unity and centrality of the Muslim Ummah, which was then titled the Ottoman Caliphate.

These emotions and feelings still exist and are re-emerging in the hearts of Muslims in every region of the world. Therefore, whenever they witness any aspect of Turkey's return from secularism to Islam and hear the mention of the Ottoman Caliphate on the lips of any of Turkey's rulers, the warmth in their hearts is rekindled, and they revive many expectations in their minds. Today's Muslim world, observing the geographical importance and ideological, cultural identity and distinction of the Islamic Republic of Pakistan, along with Turkey's gradual journey back to its past, undoubtedly witnesses the rekindling of new hopes in their hearts.

We also view President Hafiz Recep Tayyip Erdoğan's arrival in Pakistan with the same perspective and, while expressing our gratitude to him, pray to God Almighty: "O Allah! Grant Pakistan and Turkey the ability to guide the Muslim Ummah correctly at this most critical stage and to lead it out of the whirlpool of crisis. Ameen, O Lord of the Worlds."

https://zahidrashdi.org/5614